خطبات

حصہ پنجم

از

حضرت علامہ سید محمد رضی جعفر

ناشر

ادارۂ نشر علوم دینیہ

PRICE; PAK. Rs 36/-
PRICE: FOR $ 3/-

خُطبات

حصّہ پنجم

علّامہ سیّد محمد رضی مجتہد

ناشر
ادارۂ نشرِ علومِ دینیہ
فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

جملہ حقوق بحق ادارۂ نشر علوم دینیہ محفوظ ہیں!

نام کتاب — خطبات (حصہ پنجم)
تعداد طباعت — پانچ سو
طبع اوّل — ۱۹۸۶ء
مطبع — انجولی شادی کارڈ و خطاطی مرکز

مصنّف

سید محمد رضی مجتہد

ناشر

ادارۂ نشر علوم دینیہ
سی ۹۶ - بلاک نمبر ۱
فیڈرل بی ایریا کراچی
فون نمبر 683025

فہرست مضامین

نمبر شمارہ	عنوانات	صفحہ نمبر
۱	سورۂ انا انزلناہ (القدر)	۵
۲	وقولوا للناس حسناً	۹
۳	میں مسلمان کیوں ہوں؟	۱۶
۴	ملت کا مفہوم	۲۱
۵	حلم و بردباری	۳۳
۶	ہمارا ملک، ہمارا نصب العین	۳۹
۷	دیانتداری	۴۴
۸	اتمام حجت	۵۱
۹	اسلامی مساوات	۵۴
۱۰	حقوق و فرائض	۶۱
۱۱	محنت کی عظمت	۶۸
۱۲	حضرت موسیٰؑ	۷۶
۱۳	فرمان رسولؐ	۸۴
۱۴	مشورہ کی اہمیت اسلامی نقطۂ نظر سے!	۸۸
۱۵	اجتماعی نظم	۹۴
۱۶	رمضان المبارک اور قرآن حکیم!	۱۰۴
۱۷	مفکر اعظم سید دلدار علی غفران مآب بارہویں صدی ہجری کے علمی آسمان کا تابناک سورج!	۱۱۰
۱۸	آج کا دن ۲ محرم ۶۱ھ کو امام حسینؑ اور آپ کے رفقاء کربلا میں خیمہ زن ہوئے!	۱۲۱
۱۹	آج کا دن شہادت حسینؑ اور واقعۂ کربلا!	۱۲۵
۲۰	ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام	۱۳۰
۲۱	آیۃ اللہ العظمیٰ حجۃ الاسلام شمس العلماء حضرت سید نجم الحسن مجتہد اعظم	۱۳۶
۲۲	رضائے الٰہی کے تقاضے	۱۴۳
۲۳	روزے کی تاریخ	۱۵۰
۲۴	فضائل رمضان المبارک	۱۵۵

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۲۵	اقامتِ صلوٰۃ سے مُراد	۱۵۹
۲۶	اسلامی کردار	۱۶۰
۲۷	انسانی اُخوت اور اسلام	۱۶۴
۲۸	جعفر بن ابی طالب اور جنگ مُوتہ!	۱۸۱
۲۹	خیبر کی طرف روانگی	۱۸۹
۳۰	استقامت	۱۹۶
۳۱	۲۳ ربیع الاول سنہ ۱ھ	۲۰۳
۳۲	حج میں خواتین کو بال کتروانے کا حکم!	۲۰۸
۳۳	تکبر	۲۱۳
۳۴	بلند ہمتی	۲۲۷
۳۵	معرفتِ ذات یا خود شناسی	۲۲۸
۳۶	حاجتمندوں سے متعلق اسلام کی ہدایات!	۲۳۳
۳۷	جان و مال کی حُرمت	۲۳۷
۳۸	صبر و استقلال	۲۴۲
۳۹	یکجہتی	۲۴۹
۴۰	بقیع میں مزاراتِ اہلبیتؑ و اصحابِ رسولؐ	۲۵۵
۴۱	طہارت و پاکیزگی کی اہمیت!	۲۶۰
۴۲	قطرے کے احکام	۲۶۸
۴۳	صفائی اور پاکیزگی	۲۷۴
۴۴	افواہ طرازی	۲۷۹
۴۵	فضول باتوں سے پرہیز	۲۸۵
۴۶	بدنظمی	۲۸۹
۴۷	باہمی تعاون اور اسلام	۲۹۵
۴۸	خوش کلامی	۳۰۳
۴۹	دیانتداری	۳۰۸
۵۰	قول و قرار کی پابندی	۳۱۱
۵۱	عجز و انکسار	۳۱۴
۵۲	دوسروں کی اِمداد	۳۲۳
۵۳	عیب جوئی	۳۳۱
۵۴	قانون کا احترام	۳۴۰
۵۵	ملّی استحکام	۳۴۵
۵۶	ایثار و ہمدردی	۳۵۲
۵۷	اسمگلنگ	۳۶۰

سورہ اِنّا انزلناہُ (القدر)

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ۝ اِنَّآ اَنزَلنٰہُ فِی لَیلَۃِ القَدرِ ۝
وَمَآ اَدرٰکَ مَا لَیلَۃُ القَدرِ ۝ لَیلَۃُ القَدرِ ۝ خَیرٌ مِّن اَلفِ شَھرٍ ۝
تَنَزَّلُ المَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوحُ فِیھَا بِاِذنِ رَبِّھِم مِّن کُلِّ اَمرٍ ۝
سَلٰمٌ ۛ ھِیَ حَتّٰی مَطلَعِ الفَجرِ ۝

ترجمہ - بیشک ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے اور تمہیں کیا خبر ہے کہ شب قدر ہے کیا! شب قدر ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ اس رات میں فرشتے اور روح ہر کام کے لیئے اترتے ہیں اپنے رب کے حکم سے۔ یہ طلوعِ فجر تک سلامتی ہے۔

اس سورہ مبارکہ میں "لیلۃُ القدر" کے جملہ کو بار بار دہرایا گیا ہے تاکہ اس مبارک رات کی بزرگی اور عظمت و جلالت ظاہر ہو۔ "قدر" کے لفظ سے کچھ علماء نے قضا و قدر کے امور مراد لیئے ہیں اور بعض نے "قدر" سے یہاں شرف و

منزلت کو مراد لیا ہے ۔ ایک ہزار مہینوں کے سال تقریباً تراسی ہوتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ محاورۂ عرب کے مطابق یہاں مراد کثرت ہو اور مطلب یہ ہو کہ شب قدر پورے زمانہ سے بہتر و افضل ہے " الملائکۃ " سے مراد رحمت کے فرشتے ہیں اور روح سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں ۔ پھر یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ یہ رحمتِ الٰہی اس مبارک رات کے کسی خاص حصّہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی بلکہ اس پوری رات میں طلوعِ فجر تک اس کی بارش ہوتی رہتی ہے اور جو لوگ اس رحمتِ خداوندی کے مستحق ہیں اُن کے شاملِ حال ہوتی ہے ۔ رہی یہ بات کہ ہر جگہ کے طلوع و غروب کے افق مختلف ہوتے ہیں یعنی ایک ہی زمانہ میں ہر افق کے مطابق ایک معیّن زمانہ کسی خاص شب کے لئے ممکن نہیں ہو سکتا تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ بعثتِ رسولِ اکرم جس خطّۂ زمین میں ہوئی تھی اس رات سے وہیں کی رات مراد ہے مگر اس کے برکات سارے کرۂ ارض کے لئے عام ہیں اور ہر جگہ پہنچتے ہیں خواہ وہاں کوئی بھی وقت ہو اور دوسری صورت یہ ہے کہ یہ برکات دوسرے خطّوں میں

اُس وقت عطا کیئے جاتے ہیں جب وہاں کے حساب سے شبِ قدر ہوتی ہے اور یہ بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح نماز اور روزہ کے اوقات کی تعیین کی جاتی ہے۔

اِس سورۂ مبارکہ میں جن ایک ہزار مہینوں کا ذکر ہے ان سے مراد وہ مہینے ہیں جن میں شبِ قدر نہ ہو اور اُن میں کوئی لگاتار عبادت کرتا رہے تو جو ثواب اس کو ملے گا ویسا ہی اجر و ثواب بلکہ اس سے زیادہ صرف اس ایک شب کی عبادت میں عطا کیا جاتا ہے۔

اس بات میں کہ شبِ قدر سے مراد کونسی رات ہے اور کس مہینے کی رات ہے مفسرین اور علماء نے اپنی اپنی تحقیق بیان کی ہے مگر زیادہ تر علماء و مفسرین کی رائے یہی ہے کہ یہ مبارک رات رمضان المبارک کے مہینے میں ہے اور یہی بات قرآن کریم سے بھی ظاہر ہوتی ہے کیونکہ ایک جگہ اللہ نے فرمایا ہے کہ رمضان المبارک وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔ اور اس سورۂ مبارکہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ قرآن کو شبِ قدر میں اتارا گیا تو نتیجہ صاف طور پر یہ نکلا کہ شبِ قدر

رمضان المبارک ہی میں ہے - اب رہا یہ امر کہ رمضان کی کونسی رات ہے تو زیادہ تر علماء یہی کہتے ہیں کہ یہ رات رمضان کے آخری دس دنوں میں ہے اور یہ اکائی کی رات ہے - یعنی اکیسویں[۲۱]، تیئیسویں[۲۳]، پچیسویں[۲۵]، ستائیسویں[۲۷] یا انتیسویں[۲۹] راتوں میں سے کوئی ایک رات - کچھ لوگ سترھویں تاریخ کی شب پر زور دیتے ہیں - غرض اصلی شب قدر کو ان راتوں میں پوشیدہ کر دیا گیا ہے تاکہ لوگ اس شب کے برکات حاصل کرنے کیلئے بہت سی راتوں میں عبادت کا ثواب حاصل کرنے کی کوشش کریں - ان تمام کوششوں میں تیئیسویں[۲۳] اور ستائیسویں[۲۷] شب میں زیادہ احتمال ہے کہ وہی شب قدر ہو اسی لئے ملت اسلامیہ ان خاص شبوں میں خصوصی طور پر عبادت کا اہتمام کرتی ہے۔
اللہ تمام مسلمانوں کو اس عظیم شب کے برکات اور اجر و ثواب حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ/۸۳)

اسلام نے مسلمانوں کو اس کی تعلیم دی ہے کہ وہ جس سے بھی گفتگو کریں ایسے انداز اور طریقہ سے کریں جو بھلا اور پسندیدہ ہو چنانچہ آیت کے اس ٹکڑے میں بھی جو اس وقت کے موضوعِ کلام کا عنوان ہے اللہ کا یہی حکم ہے کہ لوگوں کے ساتھ اچھائی، نیکی اور بھلائی سے بات چیت کیا کرو۔ اس لفظ "حُسْنًا" کی وسعت میں بہت سی باتیں آجاتی ہیں مثلاً یہ کہ جس سے خطاب کیا جائے اس کی عزت اور شخصیت، مقام اور مرتبہ کا خیال رکھا جائے۔ جو بات کہی جائے وہ سچائی اور خلوص پر مبنی ہو یعنی اس میں بناوٹ نہ ہو، خوشامد نہ ہو، فریب نہ ہو اور جھوٹ نہ ہو پھر طرزِ کلام تہذیب سے گرا ہوا نہ ہو اور ایسے طریقہ سے نہ ہو جو سننے والے کو گراں گزرے اور اس کے دل کو تکلیف پہنچے بلکہ اس انداز سے ہو کہ بگڑے ہوئے تعلقات خوشگوار ہو سکیں اُلجھے ہوئے امور سلجھ سکیں اور گھٹی ہوئی محبت و الفت اور بڑھ سکے ایسا نہ ہو کہ محبت و اخوت کے رہے سہے رشتے بھی ٹوٹ جائیں اور بجائے دوستی اور خلوص میں اضافہ ہونے کے عداوت و دشمنی

پیدا ہو جائے یا اس میں اضافہ ہو جائے۔ اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان پورے انسانی معاشرہ میں محبت کا مجسمہ بن جائے اس لیے اس کا حکم ہے کہ وہ اپنی بات چیت میں بھی کبھی ایسا طریقہ نہ اختیار کرے جو کسی کے لیے بھی دل آزار ہو سکے اور اس کے رنج و تکلیف کا سبب بن سکے۔ خوش کلامی اور نرمیٔ گفتار بھی اسی قوت کے ساتھ بدترین دشمن کے دل کو موہ لیتی ہے جس طرح ترش کلام اور گفتگو کی تلخی بہترین دوست کو دشمن بنا دیتی ہے اسی بات کی طرف حٰم سجدہ ۴۱/۳۴ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ج وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ہ

یعنی بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوا کرتی۔ تم برائی کا ایسے طریقہ سے جواب دیا کرو جو پسندیدہ اور بھلا ہو تو تم دیکھ لو گے کہ جس شخص کے ساتھ تمہاری دشمنی تھی وہ ایسا ہو جائیگا جیسے تمہارا دلی دوست ہو اور حسن کلام اور نرمی گفتار کی نعمت ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور اسی کو ملتی ہے جو بڑے نصیب والا ہوتا ہے۔"

بلاشبہ لفظوں میں بڑی تاثیر ہوا کرتی ہے۔ یہ خوش بھی کر سکتے ہیں،

یہ غمگین بھی بنا سکتے ہیں، یہ ہنسا بھی سکتے ہیں رلا بھی سکتے ہیں، یہ دیوانوں کو ہوش میں بھی لا سکتے ہیں اور اچھے بھلوں کو دیوانہ بھی بنا سکتے ہیں۔ یہ مار بھی سکتے ہیں اور یہ دم توڑنے والوں کو زندگی کا تریاق بھی دے سکتے ہیں اور آبِ حیات سے سرشار بھی کر سکتے ہیں۔ اسی لیے مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ سخت کلامی سے پرہیز کریں اور ایسے انداز اور ڈھنگ سے گفتگو نہ کریں کہ مخاطب کو اس کے سننے سے صدمہ پہنچے اور وہ رنجیدہ ہو جائے اور بجائے محبت پیدا ہونے کے الٹے دشمنی اور اختلاف کی جڑیں مضبوط تر ہو جائیں۔ پھر اسلامی اخلاق کی اس اعلیٰ کیفیت و صفت کے لیئے اس آیت میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یہ صفت صرف اسی شخص کو حاصل ہوتی ہے جو بڑا ہی خوش نصیب ہو اور منزلِ صبر و رضا پہ فائز ہو۔ اس ارشادِ ربانی سے یہ بات پوری طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ خوش کلامی اور حسنِ گفتار کس قدر جلیل صفت ہے جو ان ہی لوگوں میں پائی جاتی ہے جنکا مرتبہ ایمان و یقین میں انتہائی بلند ہوتا ہے۔ شیریں کلامی اور حسنِ گفتار کا یہ حکم محض ایسی ہی صورت میں نہیں دیا گیا ہے جب کسی مسلمان کا مخاطب بھی مسلمان ہی ہو بلکہ ہر حال میں ایک سچے مسلمان کا یہ اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ ہر ایک سے یہی طریقۂ گفتگو اختیار کرے چاہے وہ مسلم ہو یا کافر ہو یا کوئی اور ہو۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ

اور حضرت ہارون علیہما السلام کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ فرعون جیسے منکرِ الوہیت اور مدّعیِ خدائی سے بھی، جب کلام کریں تو انتہائی نرمی کے ساتھ اور ذرا بھی لہجہ میں سختی اور تلخی نہ آنے پائے۔ سورۂ طٰہٰ ۲۰/۴۴ میں ارشادِ خداوندی ہے: فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ۔ (اے موسیٰ اور ہارون) تم دونوں فرعون کے پاس جاکر نرم لہجہ میں گفتگو کرنا تاکہ وہ نصیحت مان لے یا ڈر ہی جائے۔

اس فرمانِ خداوندی سے اس بات کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے کہ نبی و رسول سے لیکر ایک عام مسلمان تک سب ہی کے لیئے ضروری ہے کہ وہ حُسنِ گفتار اور نرمیِ کلام کو اپنا شعار بنائیں۔

پھر سورۂ بنی اسرائیل میں اسے بھی بتادیا گیا ہے کہ سارے فسادات اور جھگڑوں کی جڑ اکثر و بیشتر یہی بات ہوتی ہے کہ انسان اپنی زبان پر قابو نہ رکھے۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷/۵۳ میں اللہ کا ارشاد ہے: وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا" اے رسولؐ میرے بندوں سے کہدو کہ ہمیشہ ایسی گفتگو کیا کریں جو بہت ہی بھلی ہو، بے شک شیطان ہی لوگوں کے درمیان فساد ڈلواتا ہے۔ یقیناً شیطان تو انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اسکا مطلب یہی ہوا کہ آدمی کی

بدزبانی اور فحش کلامی ایک بڑا وسیلہ ہے شیطان کیلئے جس سے وہ آپس میں پھوٹ اور افراتفری، عداوت اور فساد کا بیج بوتا ہے اور انسانی زندگی کے نظم و ضبط کو چند لمحوں میں درہم برہم کر دیتا ہے۔ اسی سے نفرت و حقارت اور نفاق و حسد کے جذبات کی تخلیق ہوتی ہے اور اسی سے انتشار اور جنگ و جدال کی آگ کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں۔ عربی کے ایک شاعر نے خوب کہا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "نیزے کا زخم تو کبھی نہ کبھی اچھا ہو بھی جاتا ہے مگر زبان کا زخم ہمیشہ ہرا رہتا ہے اور کبھی اچھا نہیں ہوتا۔" اسی لیئے ہر مسلمان کو اللہ اور رسولؐ اکرم نے اسکی ہدایت کی ہے کہ وہ تلخ زبانی اور فحش کلامی سے ہمیشہ بچتا رہے حسن اخلاق کے ساتھ اچھی گفتگو کرے۔ محبت و الفت کے لہجہ میں بات کرے۔ سرورِ کائنات کا ارشاد ہے کہ مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ مسلمان وہی ہے جو بدزبانی اور فحش کلامی نہ کرے۔ ایک روز حضورؐ جنت کا ذکر فرما رہے تھے۔ اصحابِ کرام میں سے کسی نے عرض کی کہ یا رسول اللہ جنت کسکو ملے گی تو آپنے فرمایا کہ جس شخص کا طریقۂ گفتگو بھلا ہو، جو بھوکوں کو کھانا کھلائے۔ جو اکثر روزے رکھے اور ایسے وقت رات میں نمازیں پڑھے جب دنیا سوتی ہو۔ ایک اور حدیث میں آپنے فرمایا ہے کہ

اچھی اور نیک بات کہنا صَدَقہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جس طرح صَدَقہ دینے سے کسی محتاج کی امداد ہوتی ہے اسی طرح میٹھی زبان سے اس کے زخموں کا علاج بھی ہو سکتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابی نے آنحضرت سے دریافت کیا کہ میرے لیئے کونسی چیز سب سے زیادہ خطرناک ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ تمہاری "زبان" ہے۔

اس طرح انسانی زندگی کے انفرادی اور عمرانی تمام پہلوؤں میں گفتگو اور زبان کو بے حد اہمیت حاصل ہے اور یہی وہ آئینہ ہے جس میں انسان کی شخصیت وقابلیت، سیرت و کردار، تہذیب و ثقافت اخلاق و جذبات، عیب و ہنر اور نقص و کمال کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔ اور اس کی شخصیت کے چھپے ہوئے خدو خال ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: "اَلْمَرْءُ مَخْبُوْءٌ تَحْتَ لِسَانِہٖ" انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے یعنی ہر انسان کی اصلی شخصیت کا صحیح اندازہ اسکی گفتگو ہی سے ہو جاتا ہے اور اس کے وہ عیب و ہنر جو پس پردہ ہوتے ہیں اس کی زبان انھیں ظاہر کر دیتی ہے اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ فحش کلامی، زبان درازی، غیبت، سبّ و شتم، غیر مہذب اور غیر شائستہ طرز گفتگو اختیار کرنے والے انسان کو اسلامی تہذیب اور اسلامی تعلیم و تربیت سے دور کا بھی کوئی علاقہ

اور واسطہ نہیں ہوتا کیونکہ جو بھی سچا اور باکردار مسلمان ہوگا وہ کسی وقت بھی ان باتوں کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ حضرت امام ابوجعفر محمد باقر علیہ السلام نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ اس شخص کا دشمن ہے جو بدزبان ہو، زبان دراز ہو۔ سب وشتم اور فحش کلامی کرنے والا ہو"۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: لوگوں سے تم بھی اسی بہترین انداز پہ کلام کیا کرو جس طرح تم خود چاہتے ہو کہ لوگ تم سے انتہائی اچھے طریقہ پہ گفتگو کریں اور اپنی زبانوں کو فحش کلامی اور دریدہ دہنی سے محفوظ رکھو۔

بڑی خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ ریڈیو پاکستان نے حُسنِ گفتار اور خوش کلامی کے اس فرمان الٰہی۔ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرہ ۲/۸۳) کو اپنی زندگی کے پہلے ہی لمحہ سے اپنا شعار اور اپنی کارکردگی کا عنوان اور دستور العمل بنا لیا ہے اور اس اسلامی اور اخلاقی ذمہ داری کا اس نے اب تک جس طرح ثبوت دیا ہے وہ اپنی آپ ہی مثال ہے۔

میں مسلمان کیوں ہوں؟

یہ سوال کہ میں مسلمان کیوں ہوں؟ ہر مسلمان کو خود احتسابی کے سلسلہ میں اپنے آپ سے کرنا بے حد ضروری ہے بلکہ یہ بات کچھ اُسی شخص کے لیئے ضروری نہیں ہے جو مسلمان ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر وہ انسان جو کوئی نہ کوئی مسلک رکھتا ہو خواہ وہ مسلک کسی مذہبی اور دینی صورت میں ہو یا لامذہبیت اور لادینیت کی شکل میں ہو، اخلاقی اور عقلی بنیاد پر اس کا ذمّہ دار ہے کہ وہ اُن وجوہ اور اسباب و عوامل پر پوری آزادی اور غیر جانبداری سے غور کرے جو اس کے مسلک یا عقیدے کا سبب بنے ہیں۔

انسان کو عالمی معاشرے میں ایک خصوصی مقام حاصل ہے اسے فکر و ادراک اور شعور و تعقل و تحقیق کا وہ امتیاز اور وہ طاقت ملی ہے جو کائنات کے اس وسیع و عریض معاشرے میں کسی ایک مخلوق کو بھی نہیں دی گئی

یہ امتیاز اس کو اسی مقصد کے تحت عطا ہوا ہے کہ وہ فرائض اور ذمّہ داریوں کو پوری طرح سمجھ سکے، اپنے اچھے اور برے میں اچھے طریقہ پر امتیاز کر سکے اور اس غرض کو پورا کر سکے جس کے لیئے اسے وجود اور زندگی کی نعمت بخشی گئی ہے۔ ماحول، **صحبت**، سوسائٹی، خاندانی حالات، نسلی عوامل، گھر کے نجی حالات یقینی طور پر انسانی ذہن اور طرز فکر پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ انسان کو کائنات کے معاشرے میں ایک بلند اور خصوصی حیثیت و منزلت حاصل ہے، اس میں یقینی اور قطعی حیثیت پر یہ طاقت بھی پائی جاتی ہے کہ وہ ان تمام بندشوں کو توڑ چھوڑ کر اپنی فکر کے لیئے ایک آزاد رخ اختیار کر لے اور یہ سوچنے سمجھنے کی کوشش کرے کہ بحیثیت ایک ہوشمند اور با شعور مخلوق کے وہ ہے کیا۔ اس کی پیدائش کے عوامل کیا ہیں، اس میں کیا کیا صلاحیتیں اور قابلیتیں موجود ہیں اور ان کو بروئے کار کس طرح لایا جا سکتا ہے، یہ صلاحیتیں اسے کس نے دی ہیں اور کیوں دی ہیں، اگر وہ ان صلاحیتوں کو

بروئے کار لائے تو اسے کیا فائدے حاصل ہو سکتے ہیں اور اگر ان سے مستفید نہ ہو تو اسے کس قسم کے عواقب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ نیز اسی طرح کے دوسرے سوالات جو اس کی زندگی، اس کی پیدائش اور عقیدہ اور مسلک کے متعلق ابھر سکتے ہیں اپنے سامنے رکھے اور انھیں حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ اس کا ایک انتہائی ضروری اخلاقی اور پیدائشی فرض ہے جسے پورا کرنا اس کے لیئے لازمی ہے اور یہی بات، یہی کوشش اور یہی تحقیق و تفتیش اس کے انسان ہونے اور اشرفِ مخلوقات ہونے کا معیار ہے ورنہ دوسری صورت میں یعنی اگر وہ اس قسم کا تفکر اور اس طرح کی تحقیق و تجسس نہیں کرتا اور اپنی فکری قوتوں کو استعمال میں نہیں لاتا اور انھیں بیکار اور مفلوج کر بیٹھتا ہے تو پھر اس میں اور عام جانوروں میں کوئی فرق نہ رہے گا اور وہ اس مقام کا کسی صورت میں بھی مستحق نہ ہوگا جس کے لیئے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔

یہی فکر و نظر اور عقل و شعور اور ادراک و تدبیر کا امتیاز ہے جس کے معتدل طریقہ پر ظہور پذیر ہونے کا نام انسانیت

ہے اور جس حیوانی مخلوق کو یہ امتیاز نصیب ہے اسی کو انسان کہا جاتا ہے۔

ان تمام بنیادی عوامل کے پیشِ نظر مجھے بحیثیت ایک انسانی مخلوق کے اپنے اس امتیاز کا پوری طرح احساس ہے اس لیئے میں نے یہ ضروری سمجھا کہ میں اپنے اس پیدائشی حق کو استعمال کروں اور کہیں ان جانوروں کی طرح نہ ہو جاؤں جو مزبلوں اور کوڑے کرکٹ کے انباروں اور گندگیوں کے ڈھیر میں دن رات چکّر لگایا کرتے ہیں، جنہیں گندگی اور صاف پاک کی تمیز نہیں ہوتی نہ وہ جائز کا مفہوم جانتے ہیں اور نہ ناجائز کو پہچانتے ہیں اور نہ صفائی سے واقف ہیں اور نہ حرام سے باخبر ہیں۔ اُن کا کام صرف اپنا پیٹ بھرنا ہوتا ہے خواہ وہ کسی طرح سے بھی بھر جائے۔ اگر میں بھی بحیثیت ایک انسانی شکل رکھنے والی مخلوق کے اسی قسم کی زندگی میں پھنسا رہوں تو پھر میرے لیئے اشرف المخلوقات ہونے کا تو کوئی سوال ہی باقی نہیں رہ سکتا اور میں بھی صرف اسی طرح اور اسی نوعیت کا ایک چوپایہ ہو کر رہ جاؤں گا بلکہ اس سے بھی بدتر کیونکہ اس کے پاس تو فکر و شعور

سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور میں اس عظیم صفت کا حامل ہونے کے بعد بھی اپنی بدنصیبی کے سبب اس سے استفادہ نہیں کرتا اور اللہ کے عطا کیئے ہوئے اس امتیاز کو برباد اور اس کی نعمت کا کفران کر رہا ہوں۔ اس لیئے بحیثیت ایک انسانی مخلوق ہونے کے میرا یہ فرض ہے کہ میں اپنے وجود کے عوامل واغراض اور اپنے پورے ماحول سے آگاہ ہونے کی کوشش کروں اور اُن فرائض وحقوق کو بھی سمجھنے کی کوشش کروں جو مجھ پر عائد ہوتے ہیں۔

مجھے شعور اور غور وفکر کی طاقت اور وسائل کا مل جانا ہی خود اس کی دلیل ہے کہ مجھے میری فطرت وجبلّت فکر ونظر کی گہرائیوں کی طرف بلا رہی ہے اور دعوت دے رہی ہے کہ میں خود اپنی ذات اور پوری کائنات یعنی دوسرے لفظوں میں آفاق وانفس ؏ کو سمجھنے کی بھرپور سعی کروں۔

اب اس کے بعد میری زندگی کی پہلی منزل اسطرح شروع ہوتی ہے کہ ماں باپ کے وسیلہ سے میری پیدائش ہوتی ہے، پھر کافی عرصہ کے بعد میں شعور اور فکر کی حدوں میں داخل ہوتا ہوں اور مجھے یہ موقع حاصل ہوتا ہے کہ میں

تھوڑا تھوڑا اِدھر اُدھر کی چیزوں پر غور کروں۔ کبھی روشنی دیکھتا ہوں تو کبھی اندھیرا، کبھی چاند اور ستارے اور کبھی دمکتا ہوا سورج، پانی، غذا، ترکاریاں، مختلف اقسام کے پھل، طرح طرح کے جانور، آہستہ آہستہ مجھے چیزوں کے نام بھی یاد ہی ہو جاتے ہیں۔ جو زبان میرے والدین اور ماحول کے لوگ بولتے ہیں وہ بھی سیکھ جاتا ہوں اور آسانی سے بولنے لگتا ہوں۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ انسان کے گرد و پیش ایسے زبردست عوامل ہوتے ہیں جو اس کی زندگی کو اپنے اندر جذب کرنے اور اپنے مخصوص تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی بڑی قوت اور گہری تاثیر رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود فطری طور پر انسان کو ایک ایسی اندرونی طاقت بھی عطا ہوئی ہے کہ وہ ماحول کی تمام بندشوں کو توڑ کر ایک آزاد فکری رخ بھی اختیار کر سکتا ہے اور وہی اس کے لیے واحد نقطۂ آزمائش بھی ہے۔

جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے میں ایک مسلمان گھر اور مسلمان ماحول میں پیدا ہوا، سرورِ کائنات کی اولاد

اور آپ کی نسل میں ہونے کا مجھے شرف بھی حاصل ہے
یہ اس قدر مضبوط اور گہرے عوامل ہیں کہ میں اسلام کے
علاوہ کسی دوسرے عقیدے کو سوچ ہی نہیں سکتا تھا،
مگر پھر بھی میرا انسانی فرض تھا کہ میں ان بندشوں سے دور
ہٹ کر یہ سمجھنے کی کوشش کروں کہ میرا اسلام کیا صرف ایک
نسلی اور خاندانی مجبوری کا مظاہرہ اور صرف ایک مسلمان
ماحول کی بندش اور تاثر کا نشان ہے یا اسلام واقعی بذاتِ
خود ایک ایسا رشتہ اور زندگی کے مسائل کا ایک ایسا حل
ہے جس میں انسان کی ہر قسم کی فلاح اور بہتری مل سکتی
ہے اور اس راستہ سے الگ ہونا ہی انسان کی تباہی و
بربادی کے مترادف ہے، میں نے جب اس بات پر بھرپور
طریقہ سے غور کیا کہ ماحول کی ہر بندش اور گردوپیش کے
فضاؤں کے ہر بندھن کو توڑ کر میری فطرت میں آزاد فکر
کی زبردست قوت و صلاحیت موجود ہے تو مجھے یقین ہو گیا
کہ میں کائنات کے ہر راز کو معلوم کر سکتا ہوں اور اس کے
سربستہ بھیدوں سے پوری واقفیت اور آگاہی حاصل کرنے کی
قابلیت رکھتا ہوں جس کے تمام اسباب میرے اندر موجود ہیں اسکے

بعد یہ بات بھی طے ہوگئی کہ اب ہٹ دھرمی کیساتھ یا بہ جبر اور زبردستی کسی عقیدہ اور نقطۂ نظر کو مجھ پہ مسلّط کئے جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بھی کہ میں خود مختار فکری بنیادوں پر مسائل اور حقائق پہ فیصلہ دیسکتا ہوں اور مستقبل میں نتائج کے انتظار اور اُن سے فیصلہ کو اخذ کرنے کی مجھے کوئی بھی احتیاج نہیں ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر حماقت میری اور کیا ہوگی کہ میں کسی کی شرارت، فساد اور بغاوت کو اُس کی فتح مبین قرار دوں اگر مستقبل اُس کے حق میں ہو جائے اور اگر انقلابی تحریک ناکام ہوجائے تو میں اُس کا نام بغاوت اور جرم رکھ دوں۔

اس طرح میری فکر مجھے اس بات سے آگاہ کر دیتی ہے کہ کسی نظریہ کی اچھائی اور برائی کو اُس کے نتیجہ پر چھوڑ دینا جسے کوئی منطقی بنیاد حاصل نہ ہوسکتی ہو صرف عقلی بے مائگی اور فکری افلاس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر جب میں نے حقیقت کی جستجو میں خود اپنے جسم کی پیدائش اور اس کے انتہائی بلند حکیمانہ نظم پر غور کیا اور پھر کائنات کے بیرونی ماحول کو بھی دیکھا اور اس طرح ایک

بے لاگ تلاش کا ارادہ کیا تو مجھے یہ نظر آیا کہ کائنات کا ایک حقیر ترین ذرّہ بھی بغیر کسی پیدا کرنے والے کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہر تصویر کا ایک مصوّر ہوتا ہے، ہر اثر کا ایک مؤثر اس لیئے اس عظیم کائنات کی لا تعداد چیزیں بغیر کسی خالق کے ہرگز وجود میں نہیں آسکتی تھیں۔ پھر میں نے پورے غور سے دیکھا تو یہ حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ اس کائنات کی چیزوں کے نظامِ وجود اور نظامِ ربوبیت اور نظام ترقی و بقا و استحکام میں ایک مخصوص ترتیب، ایک مخصوص رابطہ اور ایک مخصوص اور مضبوط وحدت و یگانگت ہے جس سے مجھے یہ حقیقت بھی معلوم ہوگئی کہ اس پوری کائنات کا پیدا کرنے والا اور اسے باقی رکھنے والا اور ترقی و ترتیب کا ذمّہ دار صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور محض وہی یکتا طاقت و قدرت رکھنے والی ذات ہے جو اس کائنات کی خالق اور رب ہونے کی صلاحیت اور حق رکھتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس قادرِ مطلق خالق و رب نے کائنات کی ہر چیز کا ایک نظامِ وجود مقرر کر دیا ہے جس کے محور پر اس چیز کا پورا وجود گردش کرتا رہتا

ہے۔ چاند، سورج، ستارے، فضائیں، بہاریں، نباتات، حیوانات، فصلیں غرض کونسی ایسی چیز ہے جس کا کوئی مضبوط نظام نہ ہو تو مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ جب کائنات کی ہر ہر چیز کا نظام اُس کے خالق نے عقل و شعور کی کامل ترین بنیادوں پر متعین کیا ہے تو پھر بنی نوع انسان اس الٰہی نظام سے کیونکر محروم ہو سکتی ہے۔ پھر میں نے غور کیا تو محسوس ہوا کہ میں کسی طرح بھی براہ راست کائنات کے خالق تک رسائی حاصل کر کے اس کے بنائے ہوئے نظام کی تفصیلات خود اس سے معلوم نہیں کر سکتا۔ تو میں اس راز کو سمجھ گیا کہ جب خالق کائنات نے ہمارے لیئے کسی نہ کسی نظام زندگی کا تقرر کر دیا ہے اور اُس کا علم ہمارے لیئے ضروری بھی ہے اور جبکہ ہم خود براہ راست اسے معلوم نہیں کر سکتے تو یقیناً اس نے کچھ وسیلے اور واسطے بھی مقرر کیئے ہوں گے جن کا ہر قول و فعل اُس کی مرضی اور منشأ کے عین مطابق ہو گا تاکہ ان الٰہی ذرائع ابلاغ یعنی انبیاءؑ کی افادیت لاحاصل اور بے معنی نہ ہو سکے اس لیئے مجھے یقین کامل ہو گیا کہ خالق کائنات نے اپنے پیغام ہدایت کی ادائیگی کے فرض کو پورا کرنے کے لیئے

جن ہستیوں کو اپنی ذات اور اپنی مخلوق کے درمیان رابطہ ہونے کا منصب عطا کیا ہے یعنی انبیاءؑ و مرسلینؑ انکا معصوم عن الخطا ہونا ضروری ہے یعنی جو بات بھی وہ کہتے ہیں وہ خالق کائنات کے حکم سے کہتے ہیں اور جو اُن کا عمل ہوتا ہے وہ بھی اسی کی مرضی اور منشاء کے مطابق ہوتا ہے اور ہدایت کے ان رابطوں کا بشر اور انسان ہونا بھی ضروری ہے تاکہ ہم اُن سے بہ آسانی قربت حاصل کر سکیں اور اُن کی ذات ہمارے لیئے نمونۂ عمل بن سکے۔

رہا نبی اور رسول کا پہچاننا تو یہ ایک مشکل مسئلہ ضرور ہے لیکن ہم اس کی شخصیت اور اُس کے معجزات اور بلند ترین کردار کو دیکھ کر آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ عام انسان نہیں بلکہ نبی اور پیغمبر ہے۔ سلسلۂ نبوت تک رسائی حاصل کر لینے کے بعد پھر ہمیں آخری نبی کی ذات اقدس تک پہنچنے اور انھیں پہچاننے میں کوئی بھی دشواری نہیں ہو سکتی اور اسطرح تینں اسلام کو انسانی فطرت کے تقاضوں کے بالکل مطابق پایا جس کی مثال کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی اور اسی لیئے میں مسلمان ہوں اور اپنے مسلمان ہونے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔

مِلّت کا مفہوم

"ملّت" کا لفظ ہم برابر ہی سنتے رہتے ہیں اور ہمارے چھوٹے بڑے سب ہی اس لفظ کو جانتے ہیں اور بولتے بھی رہتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ چند لمحوں کے لیئے ہم اس لفظ کے معنیٰ اور مفہوم پر بھی غور کریں کہ یہ کس لیئے اور کس موقع پر بولا جاتا ہے تاکہ ہمیں اس لفظ کی اہمیت بھی معلوم ہو سکے۔

قرآن کریم میں یہ لفظ بہت سے مقامات پر آیا ہے۔ جن آیات میں اسے بولا گیا ہے ان کا مطلب سمجھ لینے کے بعد ہمیں خود بخود معلوم ہو سکتا ہے کہ "ملّت" کا اسلامی مفہوم کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے: وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ط قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (البقرۃ/۱۲۰) اے رسولؐ نہ تو یہودی تم سے کبھی راضی ہونگے اور نہ نصاریٰ جب تک کہ تم ان کے دین کی پیروی نہ کرو۔ تم ان سے کہدو کہ ہدایت تو بس وہی ہے جو خدا کی طرف سے حاصل ہوتی ہے پھر دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ (البقرہ/۱۳۰) اور کون ہے جو ابراہیمؑ کے طریقہ اور دین سے نفرت کرے مگر جو اپنے کو احمق بنائے۔

حضرت شعیبؑ کا تذکرہ کرتے ہوئے سورۂ اعراف/۸۸ میں ہے کہ انکی قوم میں سے جن لوگوں کو اپنی شان و شوکت پر بڑا گھمنڈ تھا کہنے لگے۔

اے شعیبؑ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کر دیں گے۔ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا۔ مگر جبکہ تم بھی ہمارے اسی دین میں لوٹ کر نہ آ جاؤ۔ حضرت شعیبؑ نے کہا: قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِکُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰہُ مِنْہَا" جب کہ تمہارے باطل دین سے خدا نے ہمیں نجات عطا کر دی اس کے بعد بھی اگر ہم تمہارے دین کی طرف لوٹ جائیں تو یقیناً ہم نے خدا پر بڑا جھوٹا بہتان باندھا سورۂ آل عمران میں خدا کا ارشاد ہے۔ قُلْ صَدَقَ اللّٰہُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّۃَ اِبْرٰہِیْمَ حَنِیْفًا ط وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ (آل عمران/۹۵) اے رسول کہدو کہ خدا نے جو کچھ فرمایا وہ سچ ہے۔ تو اب تم ملت ابراہیمی یعنی اسلام کی پیروی کرو۔ ابراہیم باطل سے کترا کر چلا کرتے تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔ سورۂ نساء میں ہے۔ اس شخص سے دین میں بہتر کون ہوگا جس نے خدا کے سامنے اپنا سر اطاعت جھکا دیا۔ اور وہ نیک اعمال بھی ہے: وَاتَّبَعَ مِلَّۃَ اِبْرٰہِیْمَ حَنِیْفًا (النساء/۱۲۵) اور وہ ابراہیمؑ کے طریقہ اور دین پر چلتا ہے۔ ملت ابراہیمی کا ذکر سورۂ انعام ۱۶۱/۶ میں یوں کیا گیا ہے اے رسولؐ کہدو کہ مجھے تو میرے پروردگار نے صراط مستقیم یعنی سیدھی راہ کی طرف ہدایت فرمائی ہے: دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّۃَ اِبْرٰہِیْمَ حَنِیْفًا (انعام /۱۶۱) وہ سیدھی راہ حضرت ابراہیمؑ کا دین ہے۔ حضرت یوسفؑ کا ذکر

کرتے ہوئے یوں فرمایا گیا ہے (یوسف/۳۷) اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ الآیۃ
میں ان لوگوں کا دین چھوڑے بیٹھا ہوں جو خدا اور آخرت کے دن پر
ایمان نہیں رکھتے: وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ
لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ - اور میں تو اپنے باپ دادا ابراہیمؑ واسحاقؑ
اور یعقوبؑ کے دین کا پیرو ہوں ہمارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو اسکا
شریک بنادیں - اس سلسلہ میں تفصیلی آیات سورہ حج آیت ۷۷/۷۸ میں بھی ملت ابراہیمیؑ
یعنی ملت اسلامیہ کی حیثیت اور اسکے مفہوم اور اسکے خصوصیات کا ذکر فرمایا گیا ہے، ارشاد
ہوتا ہے: اے ایمان والو رکوع کرو اور سجدے کرو: وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ
وَافْعَلُوا الْخَیْرَ - اور اپنے پروردگار کی عبادت کیا کرو اور نیکی کرتے رہو
تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ- وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ اور جو جہاد کرنے
کا حق ہے اس طرح خدا کی راہ میں جہاد کرو اسی نے تم کو چنا ہے اور
دین کی باتوں میں تم پر کوئی سختی نہیں کی مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ
هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا خدا نے تمہارے باپ ابراہیمؑ کے
دین کو تمہارا دین بنایا ہے - اسی خدا نے تمہارا پہلے ہی سے مسلمان نام
رکھا ہے اور اس قرآن میں بھی تمہارا یہی نام ہے - پھر فرماتا ہے :
فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ
الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ - تم پابندی کے ساتھ نماز پڑھا کرو اور زکوٰۃ

دیتے رہو اور خدا کے دین کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو وہی تمہارا بہترین سرپرست اور بہترین مددگار ہے۔ ملّت سے مراد اصل میں قانونِ الٰہی ہے چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے: فَرَضَ اللّٰہُ الطَّاعَۃَ نِظَاماً لِّلْمِلَّۃِ۔ اللہ نے اپنی اطاعت کو بندوں پر واجب کیا ہے تاکہ اس کے دین اور اس کی شریعت کا نظم قائم رہے وہ شریعت اور قانون بے معنی اور لاحاصل ہے جس پر عمل کرنا ضروری نہ ہو اس لیے ملّتِ الٰہیہ یعنی قانونِ خداوندی پر عمل کرنا ضروری ہے۔ بہر حال ملّت کے اصلی معنی اُس قانون کے ہیں جو خدا کا مقرر کیا ہوا ہو اور وہ صرف دینِ اسلام ہے جسے انبیاؑ و مرسلین اپنے اپنے طریقوں سے دنیا والوں کے سامنے پیش کرتے رہے۔ یہ ہیں اس کے حقیقی اور اصلی معنی مگر اس کے ساتھ ہی اس لفظ کے بولنے میں کچھ زیادہ وسعت پیدا ہو گئی ہے اور اسے اسلام کے علاوہ دوسرے مذہبوں اور دوسری قوموں کے رسم و رواج اور مذہبی قوانین اور ایک ملک کے لوگوں کے لیے بھی بولا جانے لگا۔ خود قرآنِ کریم میں بھی اس کو کہیں کہیں اس کے وسیع تر معنی میں بولا گیا ہے لیکن جہاں کہیں "ملّت" کا لفظ اُمّتِ اسلامیہ کے لیے بولا گیا ہے اور اُس محل پر بولا گیا ہے جس کا تعلق دینِ الٰہی پر اعتماد رکھنے والوں اور عمل کرنے

والوں سے ہے تو اس سے مراد صرف دین اسلام ہے یہ خدا کا مقرر کیا ہوا وہ قانون اور دین ہے جس کی ہر نبیؑ اور ہر رسولؑ اپنے اپنے زمانے میں تبلیغ کرتا رہا اور آخر میں اسی دینِ اسلام کی تبلیغ کے لیئے حضرت سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم تشریف لائے یہی دینِ اسلام ملّتِ محمدیؐ اور یہی ملّتِ ابراہیمیؑ ہے۔ اس ملّت اور دین کے پیرو خدا کے نزدیک مسلمان کے نام سے پکارے گئے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ حقیقت میں ملّت سے مراد دینِ الٰہی اور دستورِ خداوندی ہے جو اللہ کی جانب سے اُس کے مرسلین دنیا والوں کی ہدایت کے لیے لاتے رہے۔ اس دین اور ملّتِ الٰہی پر عمل کرنے والوں کا نام قرآن کریم کے نزدیک مسلمان ہے اور اُن کے صفات یہ ہیں کہ وہ نیکیاں کریں، برائیوں سے محفوظ ہوں، خدا کے حکم کی اطاعت کریں، اس کی عبادت کریں، اس پر سچے دل سے ایمان لائیں اور اس کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کا حق ادا کریں۔ یہی ملّتِ ابراہیمیؑ ہے۔ اسی کا نام ملّتِ محمدیؐ ہے اور اسی کو ملّتِ اسلامیہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

لفظِ ملّت کا مفہوم بہرحال ایک قانون، ایک خاص طریقہ اور مخصوص طرز کو ظاہر کرتا ہے۔ خواہ اس کے اس اصلی مفہوم کو وسعت دیکر کسی کیلئے کبھی بولا جائے مگر جب مسلمان اس لفظ کو بولتے ہیں

یا اسلامی ماحول میں اسے مسلمانوں کے لیئے بولا جاتا ہے تو وہاں اس سے مراد وہ قانون ہوتا ہے جو انسان کا بنایا ہوا نہ ہو بلکہ اللہ کا بنایا ہوا ہو اس ملّتِ اسلامیہ اور دین الہٰی کے دائرہ میں ہر وہ شخص آسکتا ہے جو دینِ اسلام کو اختیار کرے اور حکمِ خدا پر عمل کرے۔ لفظ ملّت کے مفہوم میں نہ قومیت کا امتیاز باقی رہتا ہے اور نہ قبیلوں اور خاندانوں کی تفریق پائی جاتی ہے۔ اس میں نہ تو کالے اور گورے کا کوئی فرق ہے اور نہ امیر و غریب کا نہ حاکم و محکوم اور آزاد و غلام کا کوئی تفرقہ ہے۔ جو بھی مسلمان ہے وہ ملّت اسلامی اور ملّت ابراھیمیؑ اور ملّتِ محمدیؐ کا فرد ہے اور اسے وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کو ملنا چاہئیں اس ملّتِ الہٰی کے افراد میں اگر کسی بات سے کوئی امتیاز حاصل ہو سکتا ہے تو وہ صرف کردار و عمل کی برتری ہے۔ خواہ کوئی کتنا ہی غریب و مفلس ہو اور کسی بھی قوم و قبیلہ اور ملک و نسل سے تعلق رکھتا ہو لیکن اگر وہ نیک عمل اور بلند کردار کا مالک ہو گا تو خدا کی بارگاہ میں اسی کی عزت ہو گی۔ یہ ملّت اسلامیہ ہی کو خصوصیت اور فوقیت حاصل ہے جہاں ذات پات اور رنگ نسل و قوم و ملک کا کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا اور جہاں انسانی برتری کا سب سے بڑا معیار صرف اچھا کردار اور محض اچھا عمل ہے۔

حِلم و بُردباری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ہ وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ہ (حٰمٓ السجدہ ۳۴) اللہ کا فرمان ہے کہ " نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی تم اے رسولؐ ہمیشہ نیکی کے ذریعہ سے برائی کو دفع کردیا کرو تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس شخص کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہو وہ تمہاری نیکی سے ایسا ہو جائے گا جیسے کوئی دلی دوست ہوتا ہے اور یہ بات تو صرف ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے رہتے ہیں اور اسی شخص کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا قسمت والا ہوتا ہے" فرزند رسولؐ حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ " لَا یَکُوْنُ الرَّجُلُ عَابِدًا حَتّٰی یَکُوْنَ حَلِیْمًا ،، کوئی شخص صحیح معنی میں عبادت

گذارہو ہی نہیں سکتا جب تک اُس میں صفتِ حلم نہ ہو۔ درحقیقت حلم و بردباری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب انسان کو غصّہ آئے خواہ کسی سے اپنا انتقام لینے کے لیئے یا کسی اور بات پر تو اُس وقت وہ صبر اور ضبط سے کام لے۔ حلم کی صفت بھی صبر کی ایک قسم ہی ہے۔ اور اسی لیئے اس آیۂ کریمہ میں حلم و بردباری کے ذکر میں صبر کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ حلم کی صفت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کے غیظ و غضب کے جذبات میں اعتدال کی شان پیدا ہو جائے اسی بنا پر تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ برائی کو نیکی سے دفع کر دو اور جب ایسا کرو گے تو وہ برائی کبھی آگے نہیں بڑھے گی بلکہ خود ہی فنا ہو جائے گی اور اگر کہیں اس بُرائی کو جو ہمارے لیئے باعثِ تکلیف ہوئی ہے ہم نے خود برائی ہی سے دفع کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ برائی اور بڑھے گی اور آخر نتیجہ یہی ہو گا کہ برائیاں ایک دوسرے کے جواب میں بڑھتی چلی جائیں گی اور اُن کی لپیٹ میں آ کر افراد اور معاشرہ دونوں تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں گے لیکن اس کے برخلاف اگر بدی کا جواب حُسنِ سلوک اور نیکی کے ساتھ دیا گیا تو پھر وہ

برائی کہاں تک باقی رہے گی! بالآخر ختم ہو ہی جائے گی بلکہ اس برائی کے بجائے نیکی کا ظہور ہونے لگے گا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ہمارا دشمن ہے تو ہمیں چاہیئے کہ ہم اُس کی دشمنی کا جواب نیکیوں سے دیں جس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ دشمنی نہ بڑھ سکے گی اور نہ باقی رہ سکے گی بلکہ اس کی جگہ دوستی پیدا ہوگی اور اس کا امکان ہوگا کہ وہ سخت ترین دشمن اگر ذرا بھی عقل و شعور رکھتا ہے تو وہ ہمارا بہترین دوست بن جائے گا۔ مگر یہ شان صرف اُن ہی لوگوں کی ہے جو بڑے مرتبہ والے ہیں اور انسانیت کی بلند منزل پہ فائز ہوتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ اصلی معنی میں انسان ہیں اور حقیقی معنی میں مسلمان اور مؤمن ہیں اور ایسے ہی لوگوں کا اللہ کے نزدیک بہترین مقام ہے۔ سورۂ آل عمران / ۱۳۴ میں اللہ کا ارشاد ہے " صاحبانِ تقویٰ کی تعریف میں " اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ " یہ وہ لوگ ہیں جو خوشحالی اور تکلیف و تنگدستی دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں اور جب انھیں

غصہ آتا ہے تو ضبط کر لیتے ہیں اور لوگوں سے در گذر کرتے ہیں یعنی ان کے قصور معاف کرتے ہیں اور اللہ تو احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ علامہ بیہقی اور دوسرے محدثین نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ امام زین العابدین علیہ السلام کو اُن کی ایک کنیز وضو کرا رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا تھا دفعتہً وہ لوٹا یعنی پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور امام پر گر گیا۔ آپ کو سخت تکلیف پہنچی یہ دیکھ کر اس کنیز نے قرآن کی آیت کا جملہ "الکَاظِمِینَ الغَیظَ" پڑھا تو فوراً آپ کا غصہ دور ہو گیا، پھر اُس نے کہا "اَلعَافِینَ عَنِ النَّاسِ" کہا۔ آپ نے فرمایا میں نے تیرا قصور معاف کر دیا۔ پھر اس نے آیت کا آخری حصہ پڑھا "وَاللّٰہُ یُحِبُّ المُحسِنِینَ" اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا۔ یہ سنتے ہی آپ نے فرمایا اب خوش ہو جا کہ میں نے تجھے راہ خدا میں آزاد کر دیا۔ یہ ہے اصلی اہل ایمان و یقین کے حلم و بردباری کی منزل۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حلم وہی قابل تحسین ہے جہاں انتقام کی پوری قوت اور پورا اقتدار موجود ہو اور پھر بھی انتقام نہ لیا جائے ورنہ اگر کسی میں انتقام لینے

کی قدرت ہی نہ ہو اور وہ انتقام اور بدلا اپنی کمزوری کی وجہ سے نہ لے سکے تو پھر یہ حلم نہیں ہو سکتا یہ تو مجبوری ہوگی اور اس قسم کا انتقام نہ لینا کسی طرح بھی قابلِ ستائش نہ ہوگا۔

حضرتِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے کہ پہلوان وہ شخص ہرگز نہیں ہے جو میدانِ مقابلہ میں اپنے حریف کو پچھاڑ دے اور اسے زیر کر لے بلکہ اصلی بہادر اور پہلوان وہی شخص ہے جو غصہ کے وقت جب غیظ و غضب کی آگ کے شعلے اس کے دل و دماغ کو جھلسا رہے ہوں اپنے نفس اور اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھے اور اپنے غصہ کو ضبط کر لے۔ حلم کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ غصہ میں اگر طبیعت پر قابو نہ رہے تو انسان ایسے اقدام کر بیٹھتا ہے جس کے نتیجہ میں ہر طرف سے تباہیاں اُسے گھیر سکتی ہیں اور گھیر لیتی ہیں اور اس کے لیئے ہر قسم کے خطرے پیدا ہو جانے کا پورا امکان ہو جاتا ہے مگر حلم و بردباری کی صورت میں جو بھی اقدام ہوتا ہے وہ انتہائی

سنجیدگی اور اعتدال اور نتائج کو سامنے رکھ کر ہوتا ہے اور اس کے بُرے اور اچھے نتائج کی طرف سے آنکھوں پر غفلت کے پردے نہیں ہوتے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ انسان کے لیئے امن و خوشحالی کی زندگی حلم و بردباری کی روشنی ہی میں ہے۔ غیظ و غضب اور بے صبری کے اندھیرے میں نہیں ہے۔

ہمارا ملک، ہمارا نصب العین

پاکستان کی تخلیق جس بنیاد پر ہوئی تھی وہ صرف یہ تھی کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہے جو ہندوؤں سے تہذیب و ثقافت اور نظریات میں جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اور اُسے اس بات کا پورا حق ہے کہ وہ ہندوستان سے الگ ہو کر ایک مخصوص خطہ میں اپنی آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرے اور اپنی تہذیب و ثقافت کے اقدار کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ یہ اس قدر معقول اور منطقی مطالبہ تھا جس پر اُس وقت کے بیشتر مسلمان جان و دل سے متفق تھے اور ان ہی کی زبردست کوششوں اور ان کے مثالی اتحاد و اتفاق اور قائداعظم محمد علی جناح کی سیاسی سوجھ بوجھ کا نتیجہ تھا کہ دنیا بھر نے اس مطالبہ کو تسلیم کر لیا اور پاکستان وجود میں آگیا۔ متحدہ ہندوستان میں جن لوگوں نے

اس اسلامی مطالبہ کی مخالفت کی تھی وہ یا تو خود ہندو تھے یا
پھر کانگریسی مسلمان اور ایسے غیر کانگریسی بھی جو اس مطالبہ کی
مخالفت میں ان کے شریک تھے لیکن ان لوگوں کی مخالفتوں کا
کوئی اثر نہ ہو سکا اور آخر جب پاکستان بن ہی گیا تو خود وہ لوگ
بھی اس میں آ گئے جو اس کے بنیادی طور پر مخالف تھے اور
کبھی انہوں نے ایک حرف اور ایک قدم سے بھی اس کی تائید
نہ کی تھی۔ سیاسی اور مادی شکست کھانے والوں کا یہ ایک
بڑا پرانا اور آزمودہ طریقہ کار یہی رہا ہے کہ وہ اپنے مخالفوں
کی دوستی کا روپ بدل کر ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں اور
پھر آہستہ آہستہ اپنا زہر پھیلاتے رہتے ہیں۔ پاکستان کے
بنیادی مخالفوں نے بھی اسی اصول پر عمل کیا اور وہ بڑی ہوشیاری
سے مملکت کے طول و عرض میں پھیلتے چلے گئے اور اپنی سازشوں
کے جال بچھاتے رہے۔ خود اپنے چہروں پر پاک بازی اور تقدس
کی نمائشی نقاب ڈالے رہے مگر اندرونی طور پر پاکستان کی
سالمیت و استحکام کے خلاف ہر سازش میں شریک رہے اور
ہر ایسی آگ کے لیئے ایندھن بھی فراہم کرتے رہے۔ یہ ایک
مسلّم حقیقت ہے کہ بیرونی سازشیں اندرونی سازشوں سے

بہت زیادہ خطرناک ہوا کرتی ہیں اور وہ اس وقت تک
کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتیں جب تک اندرونِ ملک
سازشیں اُن کا ساتھ نہ دیں۔ ان سازشوں کی وجہ سے
اب تک پاکستان کو جو نتیجہ بھگتنا پڑا وہ ہمارے سامنے ہے
پاکستان کی بقا اور عزت و سربلندی اسی میں ہے کہ ہم
ان اندرونی سازشوں کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیں اور بیرونی
سازشوں کو ان سے گٹھ جوڑ کرنے کا موقع نہ دیں اور باہمی
تعاون و اتحاد کے ساتھ ایک ایسی چٹان بن جائیں جس
سے ٹکرا کر پاکستان دشمن ہر سازش پاش پاش ہو جائے
وہ قومیں جو اس قسم کی بنیادی سازشوں کو نہیں سمجھتیں اور اپنے
دوست اور دشمن میں امتیاز نہیں کرتیں، ہمیشہ نقصان اُٹھاتی
رہتی ہیں۔ پاکستان کی ابتدائی تحریک سے لیکر آج تک جن لوگوں
نے اس کی مستقل طور پر مخالفت کی ہے ان میں خاص طور پر
چند مخصوص افراد ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ ہم نے پاکستان
بننے سے پہلے بھی اُن کے اس مخالفانہ کردار کو اچھی طرح دیکھا
تھا اور جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے آج تک ہم نے
کبھی کسی حکومت کے دور میں ان کی زبان و قلم سے اس کی

تائید کا اندازہ نہیں کیا - وہ پاکستان کی تاسیس کے خلاف تھے قائد اعظم کے مخالف رہے اور ہر اس شخص کے خلاف رہے جو پاکستان کی تائید کرتا ہو - پھر لطف یہ ہے کہ وہ پاکستان میں رہ کر ہر قسم کا مادی اور اقتصادی فائدہ بھی حاصل کرتے رہے اور اس وقت تک لاتعداد رقوم الحفوں نے اپنی تحریکوں کے سلسلہ میں پاکستانیوں سے حاصل کیں - کبھی بکروں کی کھالوں سے اور کبھی دوسرے طریقوں سے اور اپنے دستور کے مطابق ہر عید الاضحیٰ سے قبل انہوں نے ایک لمبی فہرست اخراجات کی شائع کر کے کل حساب صاف کر دیا کہ اس قدر بیواؤں، یتیموں، طلبہ، بیماروں اور دوسرے ضرورتمندوں پر یہ تمام روپیہ خرچ کر دیا گیا - ہوسکتا ہے کہ یہ اسٹیٹمنٹ صحیح ہوں لیکن یہ بھی ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ کسی شخص کے لیئے یہ بات ممکن نہیں ہوسکتی کہ وہ گھر گھر جا کر اس صورت حال کی تصدیق کرے کہ واقعی یہ رقوم مستحقوں کو دی گیئں یا کسی دوسرے کام میں لگا دی گیئں - زیادہ بہتر اور اطمینان بخش صورت یہ تھی کہ ان بے اندازہ رقوم سے کالج، یونیورسٹیاں، ریسرچ سینٹر اور عام تربیت گاہیں قائم کی جاتیں، جہاں سے تربیت حاصل

کر کے صالحین و صالحات کے کچھ نمونے نکلتے اور دنیا کی ہدایت کر سکتے - اس کے برخلاف ایسے لوگوں کا پورا زور اب تک صرف اس بات پر لگا رہا کہ پاکستان کی جو حکومت بھی قائم ہو اس کی مخالفت کی جائے اور یہاں کے مسلمانوں کو کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا جائے - اب جبکہ صورت حال پہلے سے مختلف ہو چکی ہے اور ہمیں پورے طور پر پاکستان کے مخالفوں کے ہر اڈّے کو پوری طرح پہچاننا ضروری ہو گیا ہے اس مرحلہ پر ہمیں اس مخصوص طبقہ کے نظریات کا بھی تجزیہ کرنا لازمی طور پر ضروری معلوم ہوتا ہے -

دیانتداری

دیانتداری کے معنی ہیں معاملات میں سچائی، امانت اور ایمانداری پر عمل کرنا۔ اب یہ امور کچھ تو وہ ہیں جن کا تعلق بندہ اور اس کے اللہ سے ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا تعلق مخلوقات سے ہوتا ہے۔ دیانتداری ان سب ہی چیزوں میں ضروری ہے۔

دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ جب انسان اس دنیا میں آتا ہے اور اس میں اچھے اور بُرے کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس پر بہت سی ذمّہ داریاں آجاتی ہیں۔ کچھ تو خدا کی طرف سے اور کچھ اس کی مخلوق کی طرف سے ان ساری ذمہ داریوں کا پورا کرنا اور ان میں امانت اور سچائی کے ساتھ کام کرنا انسان کا نہ صرف سب سے بڑا فرض ہے بلکہ صحیح معنی میں اس کو انسان ہی اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب وہ اپنے اس بنیادی فرض کو پورا کرے۔ یہ دیانتداری اور امانت جس طرح رعایا کے لیے ضروری ہے اسی طرح حاکموں کے لیے

بھی لازمی ہے ۔ جس طرح یہ نوکروں اور مزدوروں کا فرض ہے اسی طرح نوکر رکھنے والوں اور مزدوروں سے کام لینے والوں کے لیئے بھی ان کا اسلامی، اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے ۔ ماں باپ ہوں یا اولاد ہو ۔ شوہر ہو یا زوجہ ہو ۔ استاد ہو یا شاگرد ہو ۔ دوکاندار ہوں یا اُن کے خریدار ہوں ۔ غرض جس کا بھی انسانی زندگی سے تعلق ہے اس اہم ذمہ داری کو سامنے رکھنا اس کے لیئے ضروری ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دیانتداری کو انسان کے اعلیٰ صفات اور بلند اخلاق میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ اگر یہ موجود ہے تو آدمی کی ہر صفت کی قیمت ہے اور اگر اس میں دیانت کی صفت نہیں پائی جاتی تو پھر اس کی کوئی بھی قیمت نہیں اور نہ وہ کسی بلندی اور عزت و تعظیم کا حقدار سمجھا جاسکتا ہے ۔ اس تفصیل سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ دیانتداری کا تعلق صرف جائیداد یا روپے پیسے کے کاروبار ہی سے نہیں ہے بلکہ انسان کی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حصہ سے ہے مثال کے طور پر اگر ہم تجارت کرتے ہیں اور ہم نے کسی سے کوئی معاہدہ کیا ہے تو اب ہماری دیانتداری یہ ہوگی کہ ہم اپنے قول و قرار پر پوری طرح قائم رہیں اور اس کی تمام شرطوں کو پورا کریں

اور جو جو باتیں ہم نے آپس میں طے کی ہیں اُن میں کبھی کوئی فرق نہ آنے دیں - یا اگر ہمارے پاس کسی نے کوئی چیز امانت رکھی ہے تو ہمارا فرض ہو گا کہ ہم اس کی پوری حفاظت کریں اور ذرّہ برابر بھی اُس میں خیانت کا پہلو پیدا نہ ہونے دیں - اگر ہم نے کسی سے کچھ قرض لیا ہے تو ہماری یہ ذمّہ داری ہے کہ ہم اپنے وعدہ کے مطابق جو ہم نے قرض دینے والے سے کیا ہے اُس چیز کو واپس کر دیں اور اس عہد کی خلاف ورزی نہ کریں - اسی طرح اگر ہم نے کسی شخص یا کسی ادارہ کی نوکری قبول کی ہے اور ان تمام شرطوں کو منظور کر لیا ہے جو اس کام کے لیئے مقرر تھیں تو ہمارے لیئے ضروری ہے کہ ہم اپنے تمام متعلقہ فرائض کو ادا کرنے میں کبھی کوتاہی سے کام نہ لیں اور ہمیشہ پوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام کو انجام دیں -

یہاں پر دو فریق ہیں اور ان میں سے دونوں ہی کو اپنے اپنے فرائض انجام دینے میں دیانتداری اور امانت کی ذمّہ داری کو فراموش نہ کرنا چاہیئے — ایک تو وہ نوکر ہے اور دوسرا وہ شخص یا ادارہ ہے جو اسے نوکر رکھتا ہے - ایسا ملازموں کا فرض یہ ہو گا کہ وہ اس پورے وقت اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اُس کام پر صرف

کریں جس کی وہ اجرت یا تنخواہ پاتے ہیں اور جس کے لیئے انھیں نوکر رکھا گیا ہے۔ اگر وہ دفتر میں یا کام پر دیر سے آئیں گے اور جلدی چلے جائیں گے یا حاضری تو وقت سے دیں گے مگر ادھر اُدھر کی باتوں میں وقت خرچ کریں گے اسی طرح جس دفتر میں یا جہاں بھی وہ نوکر ہیں وہاں کی چیزوں کو یا وہاں کے ذرائع کو اپنے مالک یا مالکوں کی مرضی کے خلاف اپنے ذاتی مقاصد یا اپنے دوستوں اور عزیزوں کے اغراض کے لیئے استعمال کریں گے تو یہ قطعی طور پر امانت میں خیانت اور بد دیانتی ہوگی۔ اسی طرح بیماری کے جھوٹے اور فرضی سرٹیفکیٹ لیکر یا دوسرے بے بنیاد عذروں کو ظاہر کر کے اگر ہم غلط طور پر چھٹیاں حاصل کریں گے تو ہمارا یہ پورا سلسلہ بد دیانتی پر مشتمل ہوگا اور جو لوگ بھی اس فریب میں ہماری مدد کریں گے وہ سب کے سب بد دیانتی کے جرم میں شریک سمجھے جائیں گے۔ اور اب اس عمل میں صرف ایک ہی جرم نہیں ہے بلکہ اس میں بد دیانتی کے علاوہ جھوٹ، دھوکا دینا، وقت کی چوری کرنا، ایک ساتھ سب ہی جرائم موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے فریق یعنی نوکر رکھنے والے یا اجرت پر کام لینے والے کی دیانتداری یہ ہوگی کہ وہ نوکر یا مزدور کی عزت و آبرو کا خیال رکھے، اس سے

وہی کام لے اور اتنا ہی کام لے جس کے لیئے اس کی خدمت کو حاصل کیا گیا ہے، اس پر ظلم و زیادتی نہ کرے، اس کی تنخواہ یا اجرت وقت پر ادا کرے، اس سے جو وعدہ کیا ہو اسے پورا کرے اور اس کے تمام حقوق کا پورا لحاظ رکھے، اسے اپنی جائداد یا غلام نہ سمجھے اور اس ملازمت اور نوکری کی وجہ سے اس کو ذلیل اور کم حیثیت نہ خیال کرے۔ دیانت و امانت اسلامی تعلیمات کا سب سے اہم بنیادی رکن ہے جس کے بغیر اسلام و ایمان کا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اسی بنیاد پر انسانی کردار کی تعمیر کے لیئے اسلام دنیا میں آیا ہے۔ پیغمبروں کی بعثت کی بھی یہی غرض تھی۔ اور آسمانی کتابیں بھی اسی مقصد کی تکمیل کے لیئے اتاری گئیں۔ یہ اسلام کی ایک ایسی جامع تعلیم ہے جس کے وسیع دائرہ سے انسانی معاشرہ کا کوئی فرد بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ سے لے کر ایک فقیر تک۔ عالیشان محلوں میں رہنے والوں سے لیکر جھونپڑوں میں زندگی بسر کرنے والے غریبوں تک۔ ایک بڑے صنّاع سے لیکر ایک معمولی کسان تک ایک بلند مرتبہ عالم اور ماہر فن سے لیکر ایک اَن پڑھ اور جاہل انسان تک سب ہی کے لیئے دیانتداری کے ساتھ کام کرنا ضروری

ہے اور سب ہی کے لیئے امانت کے فرض کی ادائیگی لازمی ہے۔
علماء اور مفتیانِ دین کے فتوے ہوں بلکہ اور قرآن کریم نے دیانتداری
پر عمل کرنے کے لیئے ایک ایسا عام اور جامع حکم دیا ہے
جس کے اندر ہر قسم کی امانت و دیانت شامل ہے خواہ
اس کا تعلق انسانی زندگی کے کسی شعبہ ہی سے کیوں نہ ہو
ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا
(سورۂ نساء) آیۃ / ۵۸

بیشک خدا تمہیں اس کا حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو
ان کے مالکوں اور ان کے حقداروں تک پہنچا دو "امانات"
یعنی امانتیں ایک ایسا وسیع لفظ ہے جس میں وہ تمام ذمہ داریاں
بھی آجاتی ہیں جو امانت کی حیثیت رکھتی ہوں۔ حضرت سرورِ
انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: لَا اِیْمَانَ
لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ" جس کے پاس دیانتداری نہیں ہے اس
کے پاس ایمان ہی نہیں ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد
ہوا ہے: مَنْ غَشَّنَا فَلَیْسَ مِنَّا اَلْمَکْرُ وَالْخَدِیْعَۃُ وَالْخِیَانَۃُ فِی النَّارِ"
جو شخص ہمیں دھوکا دے وہ ہرگز ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہے

مکّاری، فریب اور بے ایمانی و بددیانتی سب ہی کی سزا صرف جنہم کی آگ ہے۔

اللہ ہم کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم بددیانتی کی لعنت سے اپنے ضمیر اور کردار کو محفوظ رکھیں، اس دنیا کے عارضی اور حقیر فائدہ کے لیئے آخرت کے دائمی اور سخت عذاب کے مستحق نہ بنیں اور دیانتداری کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا فرض سمجھیں جو ایک حقیقی مسلمان کا شیوہ اور اس کے سچے اسلام کی علامت ہے

اتمامِ حجّت

حق اور دیانت کی حفاظت ہمیشہ سچے ایمانداروں اور اللہ کے خاص بندوں نے قربانیوں ہی کے ذریعہ سے کی ہے۔ اسلام چونکہ انسانی فلاح و نجات کا واحد وسیلہ ہے اسلیئے اس کا باقی رہنا خود انسانیت کی بقا اور انسانی تقاضوں کا تنہا جواب اور واحد حل ہے اور اس کا زوال خود انسانی اقدار کی بربادی ہے۔ فرزند رسولؐ اللہ حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی شہادت صرف اسی نظریہ کے تحت تھی تاکہ انسانی نجات کا انحصار جس تنہا وسیلہ پر ہے اس پہ پردے نہ ڈالے جاسکیں اور باطل کی شیطانی اور طاغوتی طاقتیں دینِ حق کی اصلی صورت کو بگاڑ کر دنیا کے سامنے نہ پیش کر سکیں۔ کربلا کی عظیم ترین قربانی سے امام عالی مقام نے دین الٰہی اور شریعت محمدیؐ کے چہرہ سے نقاب الٹ کر اسکی اصلی شکل کو نوع انسان کے سامنے قیامت تک آشکار

کر دیا اور اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ حق کیا ہے اور باطل کسے کہتے ہیں۔

سر داد نہ داد دست در دست یزیدؑ
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

امامؑ نے کوفہ کا سفر اس لیئے نہیں اختیار کیا تھا کہ وہ تخت و تاج اور ایوانِ حکومت پر قبضہ کریں بلکہ آپ کا سفر صرف ایک ہی غرض کیلیئے تھا اور وہ تھی ہدایت حق۔ اسی کے ساتھ دنیادار ہوس پرستوں نے اس پیغام حق کو قبول نہ کیا اور پورے کرۂ زمین میں اس وقت کے مقدس ترین انسان نواسۂ رسولؐ اللہ حضرت امام حسینؑ کی آواز حق کو دبانے اور آپ کو شہید کرنے کے لیئے ٹڈی دل فوج لیکر آ گئے اور امام عالی مقام اور آپ کے ساتھیوں پر جو سب کے سب تین دن کے بھوکے اور پیاسے تھے حملہ کر دیا۔ امام حسینؑ اور آپ کے تمام ساتھی بڑی مثالی جرأت و شجاعت سے جنگ کر کے شہید ہو گئے۔ اور بتا گئے کہ مردانِ حق کی زندگی اور شہادت کس شان کی ہوتی ہے۔ فرزند رسولؐ نے بار بار اپنے اسی مقصد کو فوج یزید کے سامنے بیان فرمایا اور کئی مرتبہ استغاثہ کی

آواز بلند کی مگر ظالم فوج کے دل پہ غفلت کے پردے پڑے ہوئے تھے اس لیئے اُس نے اثر نہ لیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ استغاثے مختلف موقعوں پر امامؑ نے آٹھ مرتبہ کیئے تھے۔

آپ اپنے استغاثہ میں فرماتے تھے۔ "ھَلْ مِنْ نَاصِرٍ یَنْصُرُنَا" کیا کوئی نصرت کرنے والا ہے؟ جو ہماری نصرت و مدد کرے "ھَلْ مِنْ ذَابٍّ یَذُبُّ عَنْ حَرَمِ رَسُوْلِ اللّٰہِ" کیا کوئی ایسا شخص ہے جو رسول اللہؐ کے گھر والوں کی حفاظت کا فرض انجام دے۔ مگر امام حسینؑ کی اس صدائے حق کا جواب دشمنوں نے تیروں سے دیا، تلواروں سے دیا اور نیزوں اور پتھروں سے دیا۔ آخر بے رحم قاتلوں نے فرزندِ علیؑ و فاطمہؑ کو شہید کر دیا امام حسینؑ نے اپنا خون دیکر اسلام میں ابدی روح پھونک دی۔ رہتی دنیا تک حسینؑ اور اصحابؓ و انصارِ حسینؑ پہ ہمارا سلام ہو۔

اسلامی مُساوات

اسلام نے انسان کو جس مُساوات کی تعلیم دی ہے اُس کی مثال کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ ہر مسلمان کے لیئے خواہ وہ کسی خاندان اور کسی ملک یا کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ وہ احکام خداوندی پر عمل کرے اور سچّے دل سے ایمان اختیار کرے۔ اس ایمان میں اور احکام الٰہی پر عمل کرنے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ کسی خاص ملک کا رہنے والا ہو یا کسی خاص خاندان سے تعلق رکھتا ہو، اور نہ کوئی شخص اپنی بڑائی یا خاندانی عظمت کی وجہ سے اس حکم سے بچ سکتا ہے۔ کوئی شخص بادشاہ ہو یا فقیر، غریب ہو یا امیر، کسی قوم اور کسی خاندان یا ملک سے نسبت رکھتا ہو۔ سب ہی کے لیئے اسلام کے احکام پر عمل کرنا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:۔

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ” (الحجرات ۱۳) - اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہمیں نے تمہارے قبیلے اور برادریاں بنائیں تاکہ تم میں سے ایک دوسرے کو شناخت کرلے اس میں شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تم سب میں بڑا عزت والا وہی ہے جو بڑا پرہیزگار ہو۔ بے شک خدا بڑا جاننے والا (اور) بڑا واقفکار ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قبیلے اور خاندان تو صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ ان کی وجہ سے ایک دوسرے کو شناخت کر سکے اور آپس میں لوگ پہچانے جا سکیں، لیکن حقیقی عزت اور بزرگی صرف عملِ صالح سے ملتی ہے جس میں نہ خاندان کی قید ہے اور نہ قبیلہ اور ملک وقوم کی۔ اسی کے ساتھ کسی کسی مقام پر بعض لوگوں پر جو دوسروں کو فضیلت دی گئی ہے۔ جیسے ماں باپ کو اولاد پر، حاکم کو محکوم پر انبیاءؑ و مرسلینؑ کی نسلوں کو دوسری نسلوں پر تو اس ظاہری برتری کا تعلق تنظیمی، اجتماعی اور اخلاقی حیثیتوں سے ہوتا ہے۔ مگر سب کی اصل

تقویٰ اور ایمان ہی ہے کیونکہ اس کے بغیر خدا کی بارگاہ میں کوئی عزت نہیں مل سکتی۔

سرورِ کائنات نے ایک موقع پر فرمایا تھا:-

"اَلْمُسْلِمُوْنَ اِخْوَۃٌ لَا فَضْلَ لِاَحَدٍ عَلٰی اَحَدٍ اِلَّا بِالتَّقْوٰی"۔

جتنے مسلمان ہیں وہ سب بھائی بھائی ہیں۔ کسی کو کسی پر فضیلت و شرف حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ اور پرہیزگاری کے سبب سے ۸ھ میں فتح مکّہ کے موقع پر حضرت رسول اسلام نے جو اعلان فرمایا تھا وہ اسلام کی اس مساوات کا مکمّل درس ہے اور ایک ایسا پیغام ہے جس میں انسانی برتری اور عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ حضور سرورِ عالم نے فرمایا تھا:۔ اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَذْھَبَ عَنْکُمْ بِالْاِسْلَامِ نَخْوَۃَ الْجَاہِلِیَّۃِ وَ تَفَاخُرَھَا بِآبَائِھَا اَلَا اِنَّکُمْ مِنْ آدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ وَ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ"۔ خدا نے اسلام کے ذریعے زمانہ جاہلیت کا جاہلانہ دستور یعنی باپ دادا پر فخر و ناز کرنا اور نسل و قوم پر اکڑنا یہ سب کچھ مٹا دیا ہے تم سب کو یہ بات معلوم ہونا چاہیئے کہ تم سب کے سب حضرت آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے اور خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزّت والا

وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا کا خوف رکھتا ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام کے فرزند نے کفر اختیار کیا تھا تو اس کو نبیؑ کا بیٹا ہونا عذاب خداوندی سے نہ بچا سکا اور اللہ نے حضرت نوحؑ سے فرمایا (ہود/۴۶) اِنَّہٗ لَیۡسَ مِنۡ اَھۡلِکَ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ۔ اے نوحؑ یہ تمہارا فرزند تمہارے اہل سے خارج ہے کیونکہ اس کے اعمال خراب ہیں۔ اسلام نے رنگ ونسل اور قوم وقبیلہ کے فرق کو مٹا دیا ہے اور پیغمبرؐ اکرم کی خود زندگی اس کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت ہے حضرت ماریہ قبطیہؓ اس کے باوجود کہ وہ حضورؐ کی کنیزی میں آئیں مگر احترام اور عزت وایمان و تقویٰ کے لحاظ سے ان کے زوجہ رسولؐ ہونے کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آسکا۔ حضرت اُمّ المؤمنین زینبؓ بنت جحش حضرت سرورؐ کائنات کی پھوپھی زاد بہن اور جناب عبد المطلب رضوان اللہ علیہ کی نواسی تھیں ان کا پہلا عقد خود جناب رسالتمآبؐ نے زیدؓ بن حارثہ اپنے غلام کے ساتھ کیا تھا اور یہ غلام وہ تھا جس کو حضورؐ بمنزلۂ فرزند خیال فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگ زیدؓ بن حارثہ کے بجائے زید بن محمدؐ کہتے تھے، اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا اس بات کا کہ اسلام میں ذات پات، رنگ ونسل اور

قوم وقبیلہ کا کوئی فرق موجود نہیں ہے۔ مساوات اسلامی کے بہترین منظر دیکھنا ہوں تو حج کے میدان اور جماعت کی نمازوں کو دیکھئے جہاں شاہ و گدا، غلام و آقا، نوکر اور مالک، سلطانِ وقت اور رعیّت کا کوئی بھی فرق نظر نہیں آتا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز (اقبالؔ)

مسلمانوں میں کوئی نیچ قوم نہیں ہوتی۔ سب اللہ کے بندے ہیں اور سب آدمؑ کے فرزند ہیں۔ قومی اور ملکی، خاندانی اور نسلی خصوصیات صرف ایک دوسرے کے پہچاننے کے لیے ہیں اصلی عزت ان باتوں میں نہیں ہوتی۔ ایک روایت سرورِ دو عالم سے منقول ہے: "مَا عَهِدْتُ إِلَيْكُمْ فِيهِ وَرَفَعْتُمْ أَنْسَابَكُمْ فَالْيَوْمَ أَرْفَعُ نَسَبِي وَأَضَعُ أَنْسَابَكُمْ أَيْنَ الْمُتَّقُونَ"

آپ فرماتے ہیں کہ خدا قیامت کے روز فرمائے گا کہ جس بات کا میں نے تمہیں حکم دیا تھا اور جو تم سے عہد لیا تھا کہ تم میری اطاعت کرنا اور میرے حکم کو ماننا، اس عہد پر تم نے عمل نہ کیا اور اس کو ضائع و برباد کر دیا اور بجائے عمل صالح کے اپنے نسبوں اور اپنے کنبوں اور خاندانوں پر اکڑنے لگے اور اطاعت خداوندی

کو بھول گئے تو آج یعنی قیامت کے روز میں اپنے نسب کو بلند کرتا ہوں اور جس نے تجھ سے اطاعت و ایمان کا رشتہ قائم کر لیا ہے، اسی کو عزت دوں گا اور تمہارے قائم کیے ہوئے نسبوں کو گرا دوں گا اور بے حیثیت بنا دوں گا - پھر آواز آئیگی "اَیْنَ الْمُتَّقُوْنَ" صاحبان تقویٰ اور پرہیزگار لوگ اور عمل صالح کرنے والے کہاں ہیں!

(الحجرات) قرآن کریم کی آواز ہے "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" تمام ایمان والے ایک دوسرے کے بھائی ہیں اس میں نہ گورے کی قید ہے، نہ کالے کا امتیاز ہے نہ شیخ و سید کا فرق ہے - اور نہ ملکوں کی تفریق ہے - جس نے کلمۂ اسلام پڑھا وہ ہمارا بھائی ہو گیا اور اس کی عزت کرنا ہمارا فرض ہو گیا اور اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہو گئے جو کسی مسلمان کو حاصل ہو سکتے ہیں حضرت پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے کہ جتنے مسلمان ہیں اُن سب کی مثال ایسی ہے جیسے ایک جسم ہوتا ہے - اگر اس کا ایک عضو دکھتا ہے تو سارے بدن کو اس کی تکلیف محسوس ہوتی ہے اگر کسی جگہ کانٹا چبھ جاتا ہے تو اس کی اذیت جوڑ جوڑ میں پھیل جاتی ہے بس یہی حال سارے مسلمانوں کا ہونا چاہیئے جس طرح بدن کی

تکلیف میں نہ سر کی شرط ہے نہ پیر کی قید ہے۔ نہ دل کا امتیاز ہے اور نہ جگر کا فرق ہے۔ نہ آنکھوں کی تفریق ہے اور نہ ہاتھوں اور زبان یا چہرے میں کوئی علیحدگی ہے اسی طرح اسلامی معاشرہ بھی ایک جسم ہے ہر ایک کی تکلیف دوسرے کی تکلیف اور ہر ایک کی راحت دوسرے کی خوشی اور مسرت ہونا چاہیئے اور اس میں بڑے اور چھوٹے یا پست و بلند کا کوئی فرق نہ ہو۔ سچا مسلمان صرف وہ ہے جو دوسرے مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھے اور اُن کے اچھے اور بُرے میں برابر کا شریک ہو اور جو نسل و رنگ، کنبے اور ناتے یا ملک و قوم کی تفریق کرے گا اور ملتِ اسلامیہ کو طبقاتی ٹکڑوں میں بانٹنے کی کوشش کرے گا وہ قرآن و حدیث کا منکر ہے اور اس راستہ پر نہیں ہے جو اللہ اور اس کے پاک رسولؐ نے انسانی فلاح کے لیئے مقرر فرمایا ہے۔ مُسلمانوں کی دینی و دنیوی ترقی و بہبود اور ہر طرح کی کامیابی صرف اسی میں ہے کہ وہ رنگ و نسل و قوم کے فرق کی لعنت کو اپنے قریب نہ آنے دیں۔

حقوق و فرائض

اسلام کی سب سے پہلی تعلیم یہی ہے کہ ہر انسان پر اللہ اور اسکی مخلوق کے کچھ حقوق ہیں جن کا پورا کرنا اس کے لیئے ہر حال میں ضروری ہے۔ یہی امور جہاں ایک کے حقوق ہیں ساتھ ہی دوسرے کے لیئے فرائض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان حقوق کا تعلق اللہ کی ذات سے لیکر اسکی ادنیٰ ترین مخلوق تک پھیلا ہوا ہے۔ اسکو ہم یوں دیکھیں کہ جب انسان کو زندگی ملی تو اس کا پہلا تعلق اپنے پیدا کرنے والے سے ہوا اور اُس کی طرف سے انسان پر کچھ ذمہ داریاں آگئیں پھر کائنات کی ایک ایک چیز سے اس کا تعلق ہو گیا کیونکہ اس کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے میں نہ صرف دوسرے انسان بلکہ زمین و آسمان کی ہر چیز کچھ نہ کچھ مدد دیتی ہے اس لیئے یہ بات ظاہر ہے کہ پھر اس کی ذمہ داریاں بھی اپنے خالق اور کائنات کی ہر چیز سے متعلق ہوں گی۔ جہاں تک اسکی ذمہ داری اللہ سے متعلق ہے وہ یہ ہو گی کہ بحیثیت خالق جو اللہ کے حقوق ہیں

اُن کو پورا کرے اور اس کے ہر حکم کے سامنے سر اطاعت جھکا دے اور جہاں تک اُن ذمّہ داریوں کا تعلق ہے جو کائنات کی دوسری مخلوق سے متعلق ہیں ہر انسان کے لیئے ضروری ہوگا کہ وہ انھیں اس لیئے پورا کرے کہ اُنکا پورا کرنا اس کے وجود، ترقی اور بقا کے لیئے ضروری ہے۔

اللہ کے حقوق کی تفصیل شریعت نے بتائی ہے اور انبیاؑ و مرسلینؑ کی بعثت اسی غرض سے ہوتی تھی کہ وہ ہمیں اُن طریقوں سے آگاہ کریں جن سے ہم اپنے پیدا کرنے والے کے حقوق کو حتی الامکان ادا کرنے کی کوشش کر سکیں۔

رہے مخلوق کے حقوق تو ظاہر ہے کہ انسان کا دنیا کی ہر اُس چیز سے لگاؤ ہے جس سے اُس کے نفع کا تعلق ہو سکتا ہے اس تعلّق اور لگاؤ کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اس چیز کی ترقی و بقا اور حفاظت میں پوری کوشش کرے اور اُس سے وہی نفع حاصل کرے جسکے لیئے اللہ نے اُسے بنایا ہے اور اُسی طرح نفع حاصل کرے۔ جس طرح خالق کائنات نے حکم دیا ہے اور اس چیز کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس کی وجہ سے اُسکی نفع رسانی کو نقصان پہنچ سکتا ہو۔ اِن ہی ذمّہ داریوں کا نام فرائض ہے۔ اور یہ ذمّہ داریاں جن باتوں سے

متعلق ہوتی ہیں ان کا نام حقوق ہے - ان ذمہ داریوں میں اتنی وسعت ہے کہ یہ کائنات کی دوسری چیزوں ہی سے نہیں بلکہ خود انسان کی اپنی ذات سے بھی متعلق ہوتی ہیں یعنی ہر انسان پر جہاں دوسروں کے حقوق ہیں وہاں خود اپنی ذات کے بھی حق ہیں جن کا پورا کرنا ضروری ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:۔
فَاِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا (بخاری) بے شک تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے - فَاِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا - تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے - وَلِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا - اور تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے - وَلِزَوْرِکَ عَلَیْکَ حَقًّا - ملاقات کرنے والے کا بھی تم پر حق ہے۔

غرض اسلام نے ان تمام حقوق کو اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کے وسیع دائرہ میں خود انسان کی ذات سے لیکر کائنات کی ہر چیز سمٹ کر آجاتی ہے۔

جہاں تک خود انسان کی ذات کا تعلق ہے اس کو اپنی ذات کی حفاظت اور اپنی زندگی کے بچاؤ اور ترقی کیلئے جن چیزوں کی ضرورت ہے انکو حاصل کرنا اس کے فرائض میں داخل ہے - کیونکہ اسطرح

وہ اُن حقوق کو پورا کرے گا جو اُسکی ذات کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ مثلاً اپنی صحت اور زندگی کا قائم رکھنا اور اسکے لیئے جن جن باتوں کی ضرورت ہو سکتی ہے اُن کو انجام دینا۔ اس میں رہائش کے مقامات، غذا کے مسائل سب ہی آجاتے ہیں۔ لیکن بہرحال یہ حقوق اسی وقت تک کیے جا سکتے ہیں جبتک اُن کی وجہ سے دوسرے انسانوں یا دوسری کسی مخلوق کے حقوق تباہ نہ ہوتے ہوں یعنی حق اسی وقت تک حق کہا جا سکتا ہے جبتک وہ کسی دوسرے کے حق سے ٹکرا نہ جائے ورنہ وہ پھر حق نہیں بلکہ ظلم اور زیادتی میں تبدیل ہو جائے گا۔ اپنی ذات کے بعد انسان کے وہ حقوق و فرائض ہیں جن کا تعلق اُس کے گھر، اُسکے خاندان، اس کی قوم، ملک اور پوری انسانیت بلکہ پوری کائنات سے ہے۔ ان تمام حقوق کے تصور میں اس حقیقت کو سامنے رکھنا لازمی ہے جو ابھی بیان ہوئی یعنی ان حقوق کے حصول میں دوسروں کی حق تلفی کسی طرح سے کبھی نہ پیدا ہوتی ہو۔ اس طرح انسان کی اوّل تا آخر پوری زندگی کچھ حقوق اور کچھ فرائض کا مجموعہ ہے جنکو پورا کیئے بغیر وہ صحیح معنی میں انسان نہیں کیا جا سکتا۔

قرآنِ کریم اور احادیث میں ان تمام حقوق و فرائض کو تفصیل کیساتھ بیان فرما دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک انسان کی

گھریلو زندگی میں اُسکے کیا فرائض و حقوق ہوتے ہیں۔ اسلام نے اس کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ اس زندگی کے حصول میں اسکے ماں باپ کا کیا مرتبہ ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (نساء ۳۶) اللہ کی عبادت کرو اور اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کیساتھ بھلائی اور نیکی کرو۔ دوسرے مقام پر اس طرح فرمایا گیا ہے: آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے، یہ کہ اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو (انعام ۱۵۱)

یہ نو تھے وہ امور جن کا تعلق ہر انسان کے اُن فرائض سے ہے جو اس کے والدین کی طرف سے اس پر عائد ہوتے ہیں اس کے ساتھ ہی اب خود ماں باپ پر بھی اولاد کی طرف سے کچھ فرائض ہیں یعنی کچھ اولاد کے بھی حقوق ہیں جن کا پورا کرنا ماں باپ کے لیئے ضروری ہے اور وہ یہ ہیں کہ انھیں صحیح تعلیم دلوائی جائے، اُن کی ضروری تربیت اور نگرانی کی جائے، ان کی ترقی، صحت اور دوسری ضروری باتوں کا لحاظ رکھا جائے اور اُن پر ظلم و زیادتی نہ کی جائے اور جائز حدود میں اُنکے جائز حقوق کو پورا کیا جائے۔ سرکارِ دو عالم کا ارشاد

ہے : لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا " جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کا ادب اور لحاظ نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کا فرمان ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا (تحریم) اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔ اس حکم کی وسعت میں روحانی اور مادّی، دنیاوی اور آخرت کے تمام نقصانات اور خطروں سے اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو محفوظ رکھنا شامل ہے۔ اسی طرح ازدواجی تعلقات میں کچھ عورتوں کے فرائض ہیں اور کچھ حقوق ہیں اسی طرح مردوں کے بھی۔ اور اس کے لیے ایک واضح اعلان قرآن کریم میں موجود ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ - ۲۲۸) عورتوں کے حقوق مردوں پر ویسے ہی ہیں جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر اور مردوں کو اُن پر ایک منزلت ضرور حاصل ہے اور یہ منزلت اور فضیلت بھی ان کو بلاوجہ نہیں دی گئی ہے بلکہ صرف اس لئے تاکہ وہ عورتوں کی نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں جس کی طرف اس سے پیشتر کی آیات میں اشارہ موجود ہے۔

غرض اس کے بعد دوسرے قرابت داروں کے حقوق و فرائض

کی لوبت آتی ہے۔ جیسے قرآنِ کریم نے واضح کر دیا ہے۔ پھر ہمسایہ اور معاشرہ کے دوسرے افراد کے حقوق اور فرائض کے تفصیلات سمجھا دیئے گئے ہیں۔

انسان جو دولت کما تا ہے اس میں اُس کا حق بھی ہے اور کچھ اس پر دوسروں کی طرف سے فرض بھی عائد کیا جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ وہ اسے جائز و مباح ضرورتوں میں خرچ کرے اور فضول خرچی نہ کرے اور دوسروں کی طرف سے فرض یہ ہے کہ اس مال سے حاجت مندوں کی امداد کی جائے۔

قرآنِ مجید کا ارشاد ہے: وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔" اُن کے اموال میں سائل کا حق ہے اور اس کا حق ہے جو کسی اقتصادی مصیبت میں پھنسا ہوا ہو۔ (الذاریات/۱۹)

انسانی برادری کے حقوق کو بڑی وضاحت کے ساتھ قرآنِ کریم اور احادیث میں بیان کر دیا گیا ہے۔

محنت کی عظمت

اسلام نے محنت اور کوشش کے ساتھ ہر کام کو انجام دینے کی ہر مسلمان کو تعلیم دی ہے، قرآنِ کریم، سیرتِ سرورِ انبیاء، عملِ صحابہ رضؓ کرام اور اہلِ بیت اطہار کی زندگی میں محنت کی اہمیت پر بہت کچھ ہدایات ملتی ہیں - اسلامی نقطۂ نظر سے ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھنے والوں کی اسلامی معاشرہ کے اندر کوئی وقعت نہیں ہے -

قرآنِ کریم نے سورۂ النجم ۳۹ میں اس کا صاف اعلان کر دیا ہے "وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی"۔ انسان کو وہی ملے گا جس کی وہ کوشش کرے گا - اس طرح زندگی کے ہر شعبہ میں سعی اور محنت کو انسان کی کامیابی میں بڑا دخل ہے اللہ نے انسان کو عقل و فہم اور عمل کی جو قوتیں دی ہیں وہ اس لیئے نہیں ہیں کہ ان سے کوئی کام نہ لیا جائے اور تقدیر کے سہارے زندگی کے دن پورے کیئے جائیں یہ درحقیقت

اُن نعمتوں کی ناشکری ہے جو ہم کو کام کرنے کے لیئے عطا ہوئی ہیں - ہمارے لیئے ضروری ہے کہ ہم تقدیر کے بجائے تدبیر پر زور دیں جس کا ہم کو حکم ملا ہے اور جس کی بہترین مثالیں ہماری اسلامی تاریخ کے اندر ہمارے سامنے ہیں، کامیابی اُن ہی لوگوں کے قدم چوما کرتی ہے جو اپنی قوّتِ بازو اور زورِ عمل کے سہارے اپنی تقدیر بنانے کی کوشش کرتے ہیں - بالکل سامنے کی بات ہے کہ اگر مسلمان مکّہ میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تو آج اُن کی تاریخ بالکل دوسری ہوتی اور جو عظیم کامیابیاں انھوں نے حاصل کر لیں وہ حاصل نہ ہوسکتیں - ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد حضرت سرورِ انبیاؐ کی مثالی قیادت میں مسلمانوں نے جس زبردست سعی اور محنت کا مظاہرہ کیا وہ ہمارے لیئے مشعلِ ہدایت ہے - ملکی دفاع اور عسکری تنظیم ہو یا اقتصادی، صنعتی اور علمی کوششیں ہوں ہماری تاریخ بڑی ٹھوس مثالیں اور بڑے وزنی حقائق رکھتی ہے جن کو اپنے سامنے رکھ کر اور ان پر عمل کر کے آج بھی ہم اپنی پچھلی برتری کو واپس لا سکتے ہیں - انبیاؑء و مرسلینؑ کی زندگیاں بھی محنت و جفاکشی کے کاموں سے بھری ہوئی ہیں یا

جنہوں نے اس سب سے بڑے روحانی منصب کے باوجود ہمیشہ اپنی زندگی محنت کر کے اور اپنی قوتِ بازو کی کوشش سے بسر کی یہاں تک کہ کوئی پیغمبرؑ بھی ایسا نہ تھا جو صنعت و حرفت اور محنت کا کوئی کام نہ کرتا ہو حضرت آدمؑ کپڑے کا کام کرتے تھے، حضرت نوحؑ لکڑی کا کام کرتے تھے اسی طرح حضرت ابراہیمؑ اور کئی دوسرے انبیاءؑ زراعت کا کام کیا کرتے تھے اسی طرح حضرت نبی کریمؐ کی محنت کا یہ عالم تھا کہ اپنے گھر کے کام زیادہ تر اپنے ہاتھ ہی سے انجام دیتے تھے اسی طرح جنگ اَحزاب میں خندق کھودنے کا کام حضورؐ نے خود بھی انجام دیا تھا اور جب مدینہ طیبہ میں مسجد کی تعمیر ہوئی تھی تو سرورِ عالم نے بھی پتھر اٹھائے تھے اور اس کام میں حصہ لیا تھا۔ آپ کی سیرتِ پاک میں محنت کے کاموں کی ہزاروں مثالیں پائی جاتی ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: اَلبِطَالَۃُ تُقَسِّی الْقَلْبَ، کاہلی، بے عملی اور بیکاری انسان کے دل کو سخت کر دیا کرتی ہے۔ آپ نے فرمایا: مَا اَکَلَ عَبْدٌ طَعَامًا قَطُّ خَیْرًا اَنْ یَاکُلَ مِنْ عَمَلِ یَدِہٖ" ۔ مطلب یہ ہے کہ انسان جو بھی غذا کھاتا ہے اس میں سب سے افضل وہ غذا ہے جو اس نے اپنی محنت سے حاصل کی ہے۔ کہیں ان

الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔ اَلسَّاعِیْ عَلٰی نَفْسِہٖ لِیَکُفَّھَا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ کَالْمُجَاھِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالسَّاعِیْ عَلٰی اَبَوَیْہِ وَعَلٰی زَوْجَتِہٖ وَعَلٰی وَلَدِہٖ وَخَادِمِہٖ وَعَلٰی اَخِیْہِ الْمُؤْمِنِ کَالْمُجَاھِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ (البرکۃ فی السعی والحرکۃ از علامہ حبشی)

جو شخص اپنا رزق حاصل کرنے کے لیئے محنت اور سعی کرے وہ راہ خدا میں مجاہد کی طرح ہے اور وہ بھی جو اپنے ماں باپ اور اہل و عیال اور اپنے مسلمان بھائیوں یہاں تک کہ اپنے نوکروں اور خدمت گزاروں کے لیئے حصولِ رزق میں محنت و جانفشانی کرے، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے۔

روایات میں یہ بھی موجود ہے کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ اجرت پر باغوں میں پانی دیا کرتے تھے اور اس پر آپ اور آپ کے گھر والے زندگی گزارتے تھے۔ حضرت ابنؓ عباس نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سرورِ انبیاء نے علم لشکر دینے کے لیئے حضرت علیؑ کو طلب فرمایا۔ جو اصحابؓ کرام آپ کو بلانے گئے تھے انھوں نے بیان کیا کہ آپ اس وقت اپنے گھر میں چکی پیس رہے تھے۔ غرض محنت و مزدوری کرنے کا اور جفاکشی

اور سعی و کوشش کا ایک مثالی ماحول تھا جو اسلام نے پیش کیا تھا اس ماحول میں پیغمبر اکرمؐ، اہل بیت کرامؑ اور صحابۂ کبارؓ سب ہی شامل تھے۔ محنت کرنا مسلمانوں کا شعار تھا۔ امتِ اسلامیہ کا بچہ بچہ محنت کا عادی تھا جس کے واقعات سے تاریخ بھری ہوئی ہے۔ یہ محنت کشی کسی خاص شعبۂ زندگی کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ صنعت وحرفت، زراعت و تجارت فنی اور علمی تحقیقات وانکشافات نیز انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں پھیلی ہوئی تھی اس طرح اسلام نے مسلمانوں میں بلند ترین نظریات کے ساتھ عمل اور محنت کی روح پھونک دی اور مایوسی، کاہلی، دوسروں کے سہارے تلاش کرنا اور اسی قسم کی دوسری باتوں کو جن سے قوتِ عمل میں کمزوری پیدا ہوتی ہے انسانی ذہن سے نکال لینے کی پوری کوشش کی اور یہاں تک بتا دیا کہ جو شخص اپنے گھر والوں کے لئے رزق کی تلاش میں محنت نہ کرے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اس کا اسلامی معاشرہ کے اندر کوئی حصہ نہیں ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ اپنے یا اپنے گھر اور خاندان والوں کی روزی حاصل کرنا جبکہ خود اپنے معاشرہ اور اپنے ملک کی خدمت پر

موقوف ہو تو اس معاشرتی زندگی کے لیئے بھی محنت کرنا اسی طرح ہر اسلامی فرد کا فرض ہوگا جس طرح وہ خود اپنے لیئے محنت کرتا ہے کیونکہ درحقیقت افراد کا فائدہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا جب تک معاشرہ خوشحال نہو اس لیئے کہ ان دونوں کا مفاد ایک دوسرے سے قطعی طور پر وابستہ ہے بلکہ فرد کی بہبود، ترقی اور پوری زندگی ملک اور معاشرہ کی زندگی ہی پر منحصر ہے اور اس طرح جو لوگ اپنے ذاتی فائدہ کی فکر میں رہ کر معاشرہ کو پیچھے ڈال دیتے ہیں وہ نتیجہ میں خود اپنی ہی ذات کو نقصان پہنچاتے ہیں ۔ غرض قوم و ملت اور ملک و معاشرہ کے لیئے محنت سے کام کرنا اور اسے ترقی دینے کے لیئے ہر شعبۂ زندگی میں بھرپور کوشش کرنا، جہاں ایک قوم اور جماعت کی خدمت ہے ساتھ ہی خود اپنی ذات کی بھی خدمت ہے کیونکہ فرد معاشرے سے الگ رہ کر اسی طرح بے حیثیت ہوتا ہے جس طرح ایک قطرہ دریا سے نکل کر ۔ اللہ نے ہمیں قوتِ عمل دی ہے اس سے کام لینا ہمارا فرض ہے اور نہ کام لینا کفرانِ نعمت ہے لیکن شرط صرف یہ ہے کہ ہماری محنت خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر ہو اور جائز حدوں کے اندر ہو ۔ جذبۂ خدمت

کے ساتھ جذبۂ محبت و خلوص بھی ہو اور اپنے ذاتی اور قومی فرائض کا پورا احساس بھی ہو۔

اپنے فائدہ کے ساتھ دوسروں کے نقصان کی کوشش نہ ہو اور ہمارا عمل اور سعی۔ مکر و فریب، ظلم و ناانصافی، حق تلفی اور ذاتی مفاد پرستی سے پاک ہو۔ یہی قوتِ عمل آج بھی تھی جس نے پاکستان کو حاصل کیا تھا یہی محنت تھی جس سے ہم نے اپنی قلیل تعداد اور بغیر کسی ساز و سامان اور سرمایہ کے اتنا بڑا ملک حاصل کر لیا تھا اور اس سرزمین میں خدا پر بھروسا کر کے اپنی محنت کے بل بوتے پر آ گئے تھے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری اصلی منزل صرف پاکستان کا حصول ہی نہیں تھا اور فقط اسی پر ہمارا کام اور ہمارا فرض ختم نہیں ہو گیا تھا بلکہ ہمیں اپنے ہر شعبۂ زندگی میں بھرپور محنت اور جاں فشانی کر کے پاکستان کو باقی بھی رکھنا ہے اور ترقی بھی دینا ہے تاکہ ہمارا ملک اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر ساری دنیا کے لیئے ایک مثال بن سکے پھر جو ترقیاں اور کامیابیاں اب تک ہمارے ملک کو حاصل ہوئی ہیں اور عظیم ترین اقتصادی، سماجی اور دفاعی مسائل کو پاکستان نے انتہائی شاندار طریقہ پر حل کر لیا ہے وہ بھی صرف

محنت اور خلوص ہی کا نتیجہ ہے ظاہر ہے کہ اگر اس محنت اور سعی میں اضافہ ہوگا تو ملک کی ترقی اور ہمارے افراد کی خوشحالی میں بھی زیادتی ہوگی۔ ضرورت ہے کہ ہمارے دلوں میں جذبۂ خدمت ہو، ہماری قوم میں پورا اتحاد ہو، ہمارے دل و دماغ ملک کی محبت سے سرشار ہوں، فرقہ وارانہ، لسانی اور صوبائی تعصب سے ہماری نیتیں صاف اور پاک ہوں اور ہم سب پورے اتحاد اور میل جول کے ساتھ اپنے ملک کے لیے محنت و خلوص سے کام کریں اور اپنی قومی مرکزیت اور ملی وحدت کو ہر اندرونی اور بیرونی خطرہ سے محفوظ رکھیں نیز اپنے ذاتی مفاد کو قوم و ملک کے مفاد اور استحکام پر قربان کرنے کے لیئے ہر وقت تیار رہیں یہ سمجھتے ہوئے کہ ہمارا مفاد درحقیقت وہی ہے جو ہمارے ملک اور ہماری قوم کا مفاد ہے۔

حضرت موسیٰ

حضرت موسیٰ علیہ السلام عمران بن یصہر کے فرزند اور حضرت یعقوبؑ کے بیٹے لاوی کی اولاد میں تھے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کا وقتِ وفات نزدیک آیا تو انہوں نے تمام اولاد یعقوب علیہ السلام کو جن کی اس وقت تعداد ۸۰ تھی اپنے پاس بلایا تھا اور فرمایا تھا کہ تم لوگوں پر کچھ زمانہ کے بعد قبطی غالب آجائیں گے اور تم پر بے حد ظلم ڈھائیں گے پھر تم کو ایک مرد مؤمن اس مصیبت سے نجات دلائے گا جو لاوی بن یعقوبؑ کی اولاد میں ہوگا اور اس کا نام "موسیٰ بن عمران" ہوگا۔ وہ ایک بلند قامت جوان ہوگا جس کے بال گھونگروالے ہوں گے اور اس کا رنگ گندمی ہوگا۔ یہ سننا تھا کہ اسی وقت سے بنی اسرائیل اپنے فرزندوں کا نام عمران رکھنے لگے اور عمران نام کے لوگ اپنے بیٹوں کا نام "موسیٰ" رکھنے لگے۔

یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ کی ولادت کا زمانہ آگیا تو فرعون کے درباری نجومیوں نے اُس کو آگاہ کیا کہ عنقریب تیری سلطنت میں ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جو تیری سلطنت اور تیرے اقتدار کو تباہ و برباد کردیگا۔ یہ سُن کر فرعون نے تمام بنی اسرائیل پر کڑی نگرانی شروع کردی تاکہ عورتیں مردوں سے الگ رہیں اور کوئی لڑکا پیدا نہ ہوسکے مگر اس کے باوجود اللہ کی قدرت سے حضرت موسیٰؑ کی پیدائش ہوئی پھر آپ کی والدہ نے انھیں ایک چھوٹے صندوق میں بند کرکے دریائے نیل میں ڈال دیا تاکہ یہ قتل سے محفوظ رہیں اور دعا کرتی رہیں کہ اللہ اس بچہ کو زندگی عطا فرمائے یہ صندوق دریا کی موجوں کے سہارے دور تک نکل گیا اور آخر میں قصرِ فرعون کے سامنے آگیا جہاں فرعون کی بیوی آسیہ کی کنیزوں کی اس پر نظر پڑی ۔ انھوں نے شاہی محل میں اطلاع پہنچائی ۔ پھر صندوق کو کھولا گیا تو آسیہ کی نظر اس بچہ پر پڑی جو بے حد حسین و جمیل تھا ۔ آسیہ کا دل انھیں دیکھتے ہی بے حال ہوگیا ۔ اور موسیٰؑ کی محبت دل میں بیٹھ گئی ۔ گود میں اٹھالیا اور کہنے لگی کہ میں تو اسے اپنا بیٹا

بناؤں گی ۔ یہ تو بڑا ہی حسین و جمیل بچہ ہے ۔ کنیزوں نے کہا ہاں ہاں ملکہ اسکو ضرور اپنا بیٹا بنایئے اور آپ کا تو کوئی فرزند بھی نہیں ہے ۔ آسیہ جلدی جلدی فرعون کے پاس آئیں ۔ بچہ کو دکھایا اور کہا کہ اس کو قتل نہ کر ۔ یہ تو بڑا پیارا پیارا بچہ ہے ۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ میں اس کو اپنا بیٹا بناؤں گی ۔ فرعون نے پوچھا ۔ یہ کہاں سے ملا ؟ آسیہ نے جواب دیا ۔ نیل میں بہتا ہوا جا رہا تھا ۔ صندوق میں بند تھا ۔ فرعون بڑی مشکل سے اس پر راضی ہوا کہ انھیں قتل نہ کرے کیونکہ اسے شبہہ تھا کہ یہ ضرور بنی اسرائیل میں سے کسی کا فرزند ہے ۔ پھر آسیہ نے دودھ پلانے والی عورت تلاش کی مگر موسٰی نے کسی کی طرف رخ نہ کیا ۔ موسٰی ؑ کی والدہ نے جب یہ اعلان سنا تو اپنی بیٹی کو بھیجا جس نے قصر فرعون میں جا کر اس کی خبر دی کہ ایک دودھ پلانے والی موجود ہے اگر تم لوگ کہو تو میں اسے لے آؤں ۔ یہ اطلاع آسیہ تک بھی پہنچی اور بالآخر مادر موسٰی قصر میں بلا لی گئیں ۔ انہوں نے کسی پر ظاہر نہیں کیا کہ یہ خود ہی اس بچہ کی والدہ ہیں ۔ موسٰی کو انہوں نے گود میں لیا اور یہ فوراً دودھ پینے لگے ۔

یہ دیکھ کر آسیہ بہت خوش ہوئیں ۔ اور مادر موسیٰؑ کو ایک
عام دودھ پلانے والی عورت سمجھ کر مقرر کر دیا ۔ اسی حالت میں
آپؑ کی قصر فرعون میں پرورش ہوتی رہی ۔ جب بڑے ہو گئے تو
قصر کے باہر آنے جانے لگے ۔ کچھ زمانہ کے بعد بنی اسرائیل ایک
چاندنی رات میں اپنے ایک بوڑھے عالم کے پاس آئے جو صحرا
میں رہتا تھا اور کہنے لگے ۔ ہمیں اب تک بس یہ خبر ہی ملتی رہی
کہ موسیٰ نامی ہمارا کوئی نجات دلانے والا آئے گا مگر اب تک
تو کوئی آیا نہیں ۔ اور ہم ہیں کہ مصیبتوں میں مبتلا ہیں اور اُن
سے کسی طرح ہمیں چھٹکارا نصیب نہیں ہوتا ۔ اُس نے جواب
دیا کہ یہ خبر سچی ہے اور وہی تمہیں ان مصیبتوں سے نجات
دلائے گا ۔ یہ لوگ اسی بات چیت میں مشغول تھے کہ دفعتہً
ایک خوبصورت جوان کو دیکھا جو ایک خچر پر سوار تھا اور چند
لمحوں میں ان لوگوں کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ۔ بوڑھے عالم نے
اس جوان کو غور سے دیکھا تو وہ سب علامتیں اس میں موجود
تھیں جن کا ذکر آسمانی کتابوں میں پایا جاتا تھا ۔ اس نے نام
پوچھا تو آپ نے فرمایا " موسیٰ ابن عمران " نصرانی عالم یہ سنتے
ہی تیزی سے اٹھا اور آپ کے ہاتھوں اور پیروں کو بوسہ

دینے لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ سارے ہی بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کے گرد جمع ہو گئے اور سب کے سب آپ پر ایمان لے آئے۔

یہ تمام خبریں فرعون کو ملیں تو اس نے انھیں قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ حضرت موسیٰؑ کو اس کی خبر ہو گئی تو وہ مصر سے شہر "مَدیَن" روانہ ہو گئے۔ جہاں مَدیَنؑ بن ابراہیمؑ کی اولاد میں حضرت شُعَیبؑ پیغمبر رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی حضرت موسیٰؑ سے کر دی۔ پھر آپ کچھ عرصہ کے بعد اپنی زوجہ کو لیکر مصر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں ایک رات کو دور پر آگ نظر آئی۔ جب اس کے قریب گئے تو غیبی آواز سنی اور اپنی نبوّت کی خوشخبری ملی۔ اور حکم ہوا کہ موسیٰؑ تم اور تمہارے بھائی ہارونؑ مصر جاکر فرعون کو ہدایت کریں اور اس سے تنہائی میں نرمی کے ساتھ گفتگو کریں۔ حضرت موسیٰؑ فرعون کے دربار میں آئے تو دیکھا کہ وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ بڑی اونچی جگہ پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں تمام جہان کے پروردگار کا رسول ہوں تیری اور تیری قوم کی ہدایت کے لیئے۔ موسیٰؑ نے کہا

فرعون بولا! تمہارے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟

آپ نے اپنا عصا زمین پر پھینک دیا۔ عصا کی دو شاخیں تھیں
زمین پر گرتے ہی وہ عصا اژدھا بن گیا اور اس قدر بڑا اژدھا
کہ جب اُس نے اپنا مُنہ کھولا تو ایک جبڑا قصرِ فرعون کے اوپر تھا
اور دوسرا قصر کے نیچے۔ فرعون ڈر کے مارے چیخنے لگا۔ مگر اس
کے وزیر "ہامان" نے اسے تسکین دی اور کہا کہ یہ ساحر ہے
تو خوف نہ کر اور اپنے ملک کے تمام ساحروں کو طلب کر اور
موسیٰؑ سے مقابلہ کرا دے تاکہ اس کا سحر بیکار ہو جائے۔

فرعون نے اس رائے کو پسند کیا۔ تمام ساحر جمع کیے
گئے اور انہوں نے اپنی لکڑیوں اور رسیوں کو زمین پر پھینکا
تو وہ سب چلتے پھرتے سانپ نظر آنے لگے۔ یہ دیکھ کر حضرت
موسیٰؑ نے بھی اپنا عصا پھینکا تو وہ پہلے کی طرح پھر ایک عظیم
اژدھا بن گیا اور ساحروں کے سانپوں کو نگل گیا۔

ان ساحروں کی تعداد بہتّر تھی۔ عصائے موسیٰؑ کا یہ
حال دیکھتے ہی وہ سب کے سب ساحر آپ پر ایمان لے آئے
اور سجدے میں گر پڑے۔ اس کے بعد بھی فرعون کی سرکشی
کم نہ ہوئی اور بنی اسرائیل پر ظلم کے پہاڑ توڑتا رہا۔ آخر
اللہ نے حکم دیا کہ موسیٰؑ تم بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر مصر

سے چلے جاؤ۔ اس حکم کے ملتے ہی آپ روانہ ہو گئے۔
بیچ میں بحرِ قُلزُم کا شمالی تنگ سرا تھا اور دوسری جانب "تیہہ" یعنی جزیرہ نمائے "سِینَا" کا صحرا جسے صحرائے بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔ فرعون کو پتہ چل گیا کہ موسیٰؑ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے جا رہے ہیں اس نے فوراً اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ ان سب کو گرفتار کر لے اور خود بھی فوج کے ساتھ روانہ ہو گیا مگر اللہ نے حضرت موسیٰؑ اور آپ کی قوم کے لئے سمندر میں راستے پیدا کر دیئے اور سب کو نجات دیدی اور جب فرعون اور اس کا لشکر ان راستوں میں داخل ہوا تو پانی کی دیواریں گر کر برابر ہو گئیں اور فرعون سمیت پورا لشکر غرق ہو گیا۔
بحرِ قُلزُم یعنی بحرِ اَحمر کے جس حصہ کو حضرتِ موسیٰؑ نے عبور کیا تھا اس کی چوڑائی بارہ میل تھی۔

سمندر سے نکل کر حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کے ساتھ صحرائے سِینا میں داخل ہوئے اس وقت بنی اسرائیل کو نافرمانیوں کی اللہ نے یہ سزا دی کہ وہ چالیس سال تک صحراء میں گھوم کر رہتے تھے اور اس سے باہر نہ جا سکتے تھے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کی وفات صحرائے "تیہہ" ہی میں ہوئی تھی۔ پہلے حضرت ہارونؑ کی اور پھر کچھ عرصہ کے بعد حضرت موسیٰؑ کی۔

بعض نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے دو سو چالیس (۲۴۰) برس کی عمر پائی تھی۔ آپ کے اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان (۵۰۰) پانچسو سال کا فاصلہ تھا۔ حضرتِ موسیٰؑ کے بعد حضرت یُوشعؑ بن نُون آپ کے جانشین ہوئے۔

حضرتِ موسیٰؑ کے ذکر میں کوہ طور کا بھی ذکر آتا ہے اور توراۃ کا بھی۔ طُور وہ پہاڑ ہے جہاں آپ مناجات کیا کرتے تھے اور توراۃ اس آسمانی کتاب کا نام ہے جو حضرت موسیٰؑ پر اتری تھی۔

حضرت موسیٰؑ کو جو اللہ نے ہدایتیں فرمائی تھیں ان میں سے بعض یہ ہیں :- اندھیری راتوں کو عبادت کے نور سے روشن کرو، کسی فقیر اور پریشان حال کو حقیر نہ سمجھو۔ اے موسیٰؑ جو تم سے مرتبہ میں کم ہو اس پر رحم کرو اور جو تم سے بلند ہو اس پر حسد نہ کرو اور سمجھ لو کہ جس قدر فتنے ہیں ان سب کا بیج صرف دنیا کی محبت ہے۔

فرمانِ رسولؐ

قرآنی تعلیمات اور قرآنی نظامِ زندگی کی بنیاد جس واحد نظریہ پر ہے وہ صرف حقیقت پسندی ہے۔ ان تعلیمات کا رُخ نہ شخصیت پرستی کی طرف ہے اور نہ خِطّہ اور قوم پرستی کی طرف نہ ان کا تعلق کسی خاص نسل سے ہے اور نہ خاص رنگ و زبان سے۔ ان کا حقیقی مقصد یہی ہے کہ بنی نوعِ انسان کو اللہ نے جس غرض کیلیے پیدا کیا ہے وہ پوری ہو اور انسان اسی کامل ترین نظام کے مطابق زندگی گذارے جو اللہ نے اسکے لیئے مقرر و معین کر دیا ہے بنیادی طور پر قرآنی تعلیمات کا خطاب اِنسانی معاشرے کے ہر فرد سے ہے اور اس خطاب میں امیر و غریب، حاکم و محکوم، آزاد اور غلام، شاہ و گدا سب ہی ایک صف میں نظر آتے ہیں۔

حضرتِ رسالتمآب صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ بنی اسرائیل کی تباہی و بربادی کا ایک

بڑا سبب یہ تھا کہ وہ شرعی احکام کو نافذ کرنے میں مجرم کی شخصیت کو پیش نظر رکھتے تھے۔ یعنی اگر کوئی غریب و مفلس اور چھوٹا آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو سزا دیتے تھے لیکن اگر ویسا ہی جرم کوئی بڑا آدمی کرتا تھا تو اس سے کوئی بازپرس نہیں کی جاتی تھی اس لیئے میری اُمّت کو ہمیشہ اس قسم کی تفریق سے بچنا چاہیئے۔ حضور انورؐ کی پوری حیاتِ پاک اسی قرآنی اصول کا نمونۂ کامل تھی۔ آپ نے کسی موقع پر بھی الٰہی احکام کے نافذ کرنے میں طبقاتی قسم کا شائبہ تک نہیں پیدا ہونے دیا اور اپنی سیرت سے اس بات کو ثابت کر دیا کہ اسلام کی تمام تر تعلیمات کی بنیاد صرف حقیقت پسندی پر قائم ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا رخ اور رجحان اُن میں نہیں پایا جاتا۔ قرآن حکیم میں کثیر مقامات پر اسی حقیقت پسندی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اللہ کا ارشاد ہے: لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ الآیۃ۔ یعنی نیکی اس کا نام نہیں ہے کہ تم عبادت کے وقت مشرق اور مغرب کی طرف اپنے چہرے کر لیا کرو اور پھر فرمایا گیا ہے درا صل نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ پر سچے دل سے ایمان لائے۔ اسی طرح قیامت کے دن پر، فرشتوں

اللہ کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور اپنا مال اللہ کی محبت میں قرابتداروں، یتیموں، محتاجوں، پریشان حال مسافروں اور عام ضرورت مند سوال کرنے والوں کو دے اور لوگوں کی گردنیں چھڑانے میں صرف کرے، نماز پابندی سے پڑھا کرے، زکوٰۃ باقاعدہ ادا کیا کرے اور یہ لوگ جب کوئی عہد کریں تو اسے پورا کریں اور فقر و فاقہ اور تکلیف و بیماری میں صبر سے کام لیں اور جب کبھی جہاد کا موقع آئے تو اس میں دشمنانِ اسلام کے مقابلہ میں ثابت قدم رہیں۔ ایسے ہی لوگ سچے مؤمن ہیں اور یہی متقی اور پرہیزگار ہیں۔ اس آیت میں بنی نوع بشر کیلئے اعتقادی اور عملی حیثیت سے ایک ایسے نظام زندگی کی تعلیم دی گئی ہے جو اس کے وجود کے ہر ہر جزو پر حاوی ہے۔ اس کو لاکھوں قسم کی پرستشوں سے بچا لیا گیا جس میں اس کی ہلاکت و تباہی کے سارے ہی اسباب جمع تھے اور صرف واحد و یکتا اللہ کی عبادت و اطاعت کا حکم دیا گیا کہ اسی میں اس کی فلاح و نجات پوشیدہ ہے اس لیئے کہ انسان کی نجات اور فلاح غیر اللہ کے بنائے ہوئے ناقص نظام میں ممکن نہیں ہو سکتی اور اگر ہو سکتی ہے تو صرف الٰہی

نظام پر عمل کرنے میں۔ قرآنِ حکیم نے ہمیں بتایا ہے کہ انسان کا اصلی حاکم اور مالک اور خالق ورازق صرف اللہ ہے اور اسی کے حکم پر چلنے میں اس کی نجات ہے۔

اقتصادی پہلو کے ساتھ ہی اس آیت میں انسان کے عملی شعبوں کے لیئے کچھ بنیادی اصول بتائے گئے ہیں۔ غرض انسانی اقدار کی حفاظت اور انسان کے انفرادی اور اجتماعی حقوق اور ذمّہ داریوں کا جس طرح اسلام نے سبق دیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

حیاتِ انسانی کے اِن دونوں پہلوؤں سے متعلق قرآنِ حکیم نے جو انتہائی مضبوط نظام ہمیں بتایا ہے وہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے آگے اور آفاقی ہے اور قیامت تک اسمیں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ یہ عظیم نظام قرآنِ حکیم کی صورت میں ہمیں رمضان ہی کے مبارک مہینہ میں دیا گیا جس کا ہر دن برکتوں اور رحمتوں کا خزانہ ہے خصوصیت کے ساتھ اسکے آخری جمعہ یعنی جمعۃ الوَدَاع کی فضیلت کی تو انتہا ہی نہیں ہے۔ مبارک ہیں وہ اللہ کے مخلص بندے جو اس عظیم دن کی برکتوں سے محروم نہ رہیں۔

مشورہ کی اہمیت اسلامی نقطۂ نظر سے

انسان کتنا ہی ذی علم اور تجربہ کار ہو لیکن ہر وقت اِس کا امکان ہے کہ اُسکے فیصلہ اور فکر میں غلطی واقع ہو جائے اس لئے اسلام نے اسے ضروری قرار دیا ہے کہ ایسے تمام اجتماعی یا انفرادی کاموں میں جن میں مشورہ کی گنجائش ہو آپس میں ضرور مشورہ کیا جائے اور ایسے لوگوں سے مشورہ کیا جائے جو اس کی پوری اہلیت اور صلاحیت رکھتے ہوں اور عقل و شعور اور فہم و تدبر میں بلند مرتبہ پر فائز ہوں ۔جب کسی مسئلہ کو بہت سے لوگ فکر و نظر کے مختلف زاویوں سے دیکھیں گے تو یقیناً اُن سے مل جُل کر ایک ایسا فیصلہ اُبھر کر سامنے آجائیگا جس میں غلطی اور خطروں کے امکانات کم سے کم ہوں گے اور انفرادی استبدادی رائے سے جو تباہکن نتائج ظاہر ہو سکتے ہیں ان سے بڑی حد تک بچاؤ ممکن ہو سکے گا آپس میں مشورہ کرنے میں جہاں اور فائدے ہیں ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے باہمی تعلقات خوشگوار ہو جاتے ہیں محبت کا رشتہ مضبوط تر ہو جاتا ہے ، خلوص اور اتحاد و اتفاق میں زیادتی ہوتی ہے ہمدردی کا جذبہ اُبھرتا ہے اور ہر ایک شخص کی قدر دوسرے کے

دل میں بڑھ جاتی ہے، لبس ضرورت سب سے زیادہ اسی کی ہے کہ مشورہ کرنے میں بھی خلوصِ دل سے کام لیا جائے اور مشورہ کے نتیجہ پر عمل کرنے اور اس کی پابندی کرلینے میں بھی پوری دیانت اور اخلاص کا ثبوت دیا جائے کیونکہ بہر حال مشورہ تو دوستوں ہی سے کیا جاتا ہے اور اس توقع سے کیا جاتا ہے کہ ہر فریق پورے خلوص کے ساتھ مشورہ طلب مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرے گا اور اس مشورہ کے نتیجہ کا دل سے احترام کرلیگا۔ اس لیئے جہاں مشورے سے انفرادی فائدے وابستہ ہیں ساتھ ہی ہماری اجتماعی زندگی کے لیئے بھی باہمی مشاورت ترقی، استحکام اور فلاح و کامیابی کا بہترین ذریعہ ہے باہمی مشاورت سے ذہنی اور فکری طاقتوں کو نئے نئے راستے ملتے ہیں، ان کی فطری صلاحیتیں اُجاگر ہوتی ہیں۔ مشورہ کرنے والوں کی عملی طاقت میں ایک جدید اور تازہ ولولہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ استحکام حاصل ہوتا ہے جو بغیر مشورہ کے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا اس طرح باہمی مشورہ ایک بڑی نعمت ہے جس کے سہارے سے افراد اور قوموں نے تاریخ میں اپنے لیئے عظیم جگہ پیدا کی ہے اور وہ ایسی مضبوط چٹان میں تبدیل ہو گئی ہیں جو ہمیشہ اپنے دشمنوں کے لیئے ناقابلِ تسخیر ثابت ہوئیں۔ باہمی مشاورت گھریلو زندگی کی محدود سطح پر ہو

یا قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے معیار پر اجتماعی اور وسیع تر دائرہ میں ہو ہر جگہ یہ استحکام، قوت، اتفاق و اتحاد، خلوص و محبت، ترقی اور فلاح و نجات کا زبردست سرچشمہ اور وسیلہ ہے بشرطیکہ اس کی بنیادیں درست ہوں اور انتہائی پرخلوص طریقہ پر اس مشاورت کو صحیح نتائج کے حصول کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی جائے اسلیے کہ اگر اسے اس کے ان بنیادی حدود سے ہٹا دیا جائے گا تو پھر سب سے بڑا خطرہ اور خوف اس بات کا ہے، کہ یہ استحکام کا وسیلہ بننے کے بجائے آپس کی پھوٹ اور داخلی و خارجی انتشار کا ذریعہ بنکر تباہی و بربادی کی علامت بن جائیگی بالکل اسی طرح جیسے ہم اپنی ہی تلوار سے خودکشی بھی کر سکتے ہیں اور دشمن کا دفاع بھی۔ باہمی مشورہ بھی ایک ہتھیار کی حیثیت رکھتا ہے جس کا صحیح استعمال قوموں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے استحکام اور خوشحالی کی ضمانت ہے۔ جبکہ اس کا غلط استعمال تباہی اور رسوائی کا پیغام ہے۔

سورۂ آل عمران میں اللہ کے اس ارشاد میں بڑے اہم اشارے ہیں جس سے ہم اپنی زندگی کے اس انتہائی ضروری پہلو کے لیے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ج وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ص فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ

لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ج فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰہِ ط اِنَّ اللّٰہَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (آل عمران ۱۵۹) (اے رسولؐ) یہ اللہ کی رحمت ہی کے سبب سے ہے کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نرم رہے اور اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے منتشر ہو گئے ہوتے۔ تو تم ان لوگوں سے درگزر کرو اور ان کے لیے استغفار کرو اور ان سے معاملات میں مشورہ کرتے رہو لیکن جب اسکے بعد تم پختہ ارادہ کر لیا کرو تو پھر اللہ پر بھروسا رکھو بیشک اللہ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اس پر بھروسا رکھتے ہیں۔

سورۂ "شوریٰ" میں ان لفظوں کے ساتھ سچے اہل ایمان کی تعریف فرمائی گئی ہے: وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (شوریٰ ۳۸) وہ اپنے پروردگار کا حکم مانتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور ان کے کل کام آپس کے مشورہ سے ہوتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُنھیں رزق دیا ہے اُس میں سے وہ راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی وجہ سے کبھی انتظامی امور میں اصحابؓ کرام سے مشورہ فرمایا کرتے تھے باوجودیکہ آپ کو کسی سے بھی مشورہ کی ضرورت نہ تھی اور آپ کو اللہ نے علم و فکر اور نبوتؐ

رسالت کا وہ مرتبہ عطا کیا تھا جو کائنات میں کسی کو بھی حاصل نہ تھا لیکن اس بات سے لوگوں کی ہمت افزائی ہوتی تھی اور اُن تمام لوگوں کے لیے یہ ایک مثال قائم ہو رہی تھی جو واقعی طور پر مشورہ کے محتاج ہوتے ہیں۔ لوگوں نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ اللہ نے جو یہ فرمایا ہے کہ جب تم عزم کر لو تو پھر خدا پر بھروسا کرو اس "عزم" کا کیا مطلب ہے، تو آپ نے یہی فرمایا تھا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب تم صاحبانِ عقل و تدبّر سے مشورہ کر لو تو پھر اس فیصلہ پر قائم ہو جاؤ اور اللہ کی ذات اور اس کی مدد پر بھروسا رکھو، ایک حدیث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جس شخص سے مشورہ کیا جاتا ہے وہ امین ہوتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ رائے دینا بھی ایک بڑی امانت کی ادائیگی ہے اور اس میں خیانت سے کام لینا اور مشورہ کے صحیح مفاد کو ہوا و ہوس اور ذاتی یا منافقانہ رجحانات کی بنا پر نظر انداز کرنا کسی مسلمان کے لیئے جائز نہیں ہے بلکہ اس کام میں اسی امانت و دیانت اور خلوص و وفا کا عملی ثبوت دینا ضروری ہے جو ایک سچے مؤمن اور توحید پرست کا طرّۂ امتیاز اور اس کی لازمی خصوصیت ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جب تم سے تمہارا کوئی بھائی مشورہ کرے تو تم اس کو

بھلی بات کا مشورہ دو یعنی مشاورت کے اس انسانی حق کے تعمیری پہلو کو چھوڑ کر اُسے کسی قسم کے بھی تخریبی پہلو کے لیئے استعمال نہ کرو اور جب مشورہ کا کام اپنی جامع اور درست بنیادوں پر مکمل ہو جائے تو پھر پورے عزم ویقین اور مضبوط جذبہ عمل کے ساتھ اس کام کو انجام دو اور خدا پر بھر پور توکل اور بھروسا رکھو۔ غرض اہلیت رکھنے والوں سے مشاورت کرنا مسلمانوں کا اسلامی شعار ہے اور کسی کو رائے دینا ایک ایسی امانت کی ادائیگی ہے جس میں کسی طرح بھی خیانت کا ارتکاب کرنا کسی مسلمان کے لیئے کبھی جائز نہیں ہو سکتا۔ باہمی مشاورت انفرادی اور اجتماعی، اقتصادی اور سماجی بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں باہمی فلاح و کامیابی کے لیئے ایک بڑی بنیاد اور اہم ترین ضمانت اور مستحکم ترین وسیلہ اور سرمایہ ہے۔

اجتماعی نظم

اسلام نے معاشرہ کے نظم و ضبط کی اہمیت کے متعلق قرآن حکیم اور حدیثِ رسول ؐ کے ذریعہ سے بنی نوع انسان کو بڑی شدت کے ساتھ توجہ دلائی ہے۔ بلاشبہ اجتماعی نظم و ضبط کی ابتری نہ صرف معاشرہ کیلئے تباہ کن ہے بلکہ اس تباہی سے انفرادی زندگیاں بھی خواہ وہ کتنی ہی محفوظ بن چکی ہوں بچ نہیں سکتیں۔ اجتماعی نظم کے برقرار رہنے ہی میں معاشرہ اور فرد دونوں کی حفاظت و سلامتی پوشیدہ ہے۔ اسی بناء پر قرآن حکیم نے فرد کے وجود کی اہمیت کا بار بار احساس دلایا ہے کیونکہ جب تک فرد کی سلامتی اور اس کا وجود محفوظ نہ ہوگا، معاشرہ بھی محفوظ نہیں رہ سکتا اس لئے کہ معاشرہ افراد ہی کی اجتماعی صورت کا نام ہوتا ہے اور اجتماعی زندگی انفرادی حیات ہی سے تشکیل پاتی ہے۔ سورۂ مائدہ میں اللہ نے فرمایا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا

قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَمَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ " جو شخص کسی کو نہ تو جان کے بدلے میں اور نہ مُلک میں فساد پھیلانے کی سزا میں، قتل کر ڈالے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور اس طرح جس شخص نے کسی ایک آدمی کو جلا لیا تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو حیات دے دی۔

اس طرح نوع انسان کو اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ ایک فرد کی اہمیّت پورے معاشرہ کے برابر ہوتی ہے تاکہ ہر ہر فرد نوع کو امن وامان اور حفاظت وسلامتی کی نعمت حاصل ہو سکے کہ یہی اجتماعی نظم کو قائم اور برقرار رکھنے کا سب سے اہم بنیادی وسیلہ ہے۔

سورۂ مائدہ کی ایک دوسری آیت[۸] یہ ہے۔ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ " اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل و انصاف کو چھوڑ بیٹھو۔ عدل تو تمہیں ہر صورت میں کرنا چاہیئے کہ یہ بات پرہیزگاری سے بہت قریب ہے"۔ دشمنی اور عداوت یا انتقام کے جذبہ میں انسان کی عقل مغلوب ہو جایا کرتی ہے

اور وہ حق و ناحق میں فرق نہیں کرتا۔ اسلام نے ایسے سنگین موقع پر خصوصیت کے ساتھ اسے تعلیم دی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی ناانصافی نہ کرے اور اپنے جذبات کو عقل کا تابع رکھے اور وہی کچھ کرے جو انصاف کا تقاضا ہو یہ صرف اس لئے کہ خودغرضی اور ذاتی خواہش اور ذاتی جذبات سے مغلوب ہو کر وہ کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھے جو معاشرہ کے اجتماعی نظم میں ابتری پیدا کر سکے اور عقل و انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہو۔

اسی روح اجتماعی کو اجاگر کرنے کے لئے سورۂ آلِ عمران میں اس طرح فرمایا گیا ہے: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۖ اور تم سب کے سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رہو اور آپس میں انتشار نہ پیدا کرو۔ اللہ کی رسّی سے مراد اسلام و قرآن اور اسلامی اخوّت ہے۔ ان لفظوں کے ساتھ یہ حقیقت سمجھائی جارہی ہے کہ اجتماعی نظم و ضبط ہی میں ہماری زندگی ہے اور آپس کی پھوٹ میں خواہ وہ کسی لباس اور کسی شکل میں ہو ہماری تباہی اور موت ہے۔

اسی سلسلہ میں انسانی تاریخ کے ایک خاص موڑ کی طرف

قرآن نے اشارہ کیا ہے: (آل عمران ۱۰۳) وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔" اور اپنے اوپر اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اسی نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے: وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔" (ترجمہ) اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو اللہ ہی نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تم کو اپنی آیتیں وضاحت کے ساتھ سناتا ہے تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

یہ اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت سے پہلے مدینہ کے دو اہم ترین قبیلوں "اوس" اور "خزرج" کے درمیان عرصۂ دراز سے شدید خانہ جنگی چلی آ رہی تھی اور یہ دونوں طاقتور قبیلے ایک دوسرے کے خلاف مسلسل جنگ کرتے رہتے تھے۔ ان کی اس طوفانی لڑائی کو مؤرخوں نے "جنگِ بُعاث"

کا نام دیا ہے جبکہ "بُعاثْ" مدینہ کے قریب ایک خاص آبادی اور خطّہ کا نام ہے جو اس خونریز لڑائی کا مرکز تھا۔ غرض "اَوْس" اور "خَزرَج" ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ یہ لڑائی کا سلسلہ طویل زمانہ سے جاری تھا۔ خون پر خون ہو رہے تھے اور انتقام کی آگ کے شعلے روز بروز تیز تر ہوتے جا رہے تھے اور ان دونوں قبیلوں میں صلح صفائی کی کوئی صورت بھی ممکن نہ تھی۔ عین اُسی زمانہ میں جب ان قبیلوں کی آپس کی دشمنی و عداوت اور جنگ اور قتل و غارت پورے زور شور سے جاری تھی رسولِ رحمت حضرت سردارِ انبیاء مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائے۔ اَوْس و خَزْرَج کے کانوں میں اسلام کی آواز پہلے ہی سے پہنچنا شروع ہو گئی تھی اب ان کے سامنے داعیِ اَمْن اور نبیِ رحمت، معلّمِ اخوّت و اتحاد اور رسولِ امن و سلامتی خود بہ نفسِ نفیس موجود تھے۔ آپ نے مدینہ پہنچ کر پہلا کام یہ کیا کہ مہاجرین و انصار اور مکّی و مَدَنی لوگوں میں ہر ایک کو دوسرے کا اسلامی بھائی بنادیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی لمحوں میں وہ تاریخی دشمنیاں مٹ گئیں

عداوت و انتقام کی آگ بجھ کے رہ گئی۔ بدلا لینے کے منصوبے پاش پاش ہو گئے اور جو آپس میں ایک دوسرے کے بدترین دشمن اور خون کے پیاسے تھے وہ بالکل سگے بھائیوں کی طرح ہو گئے ایک دوسرے کا فدائی بن گیا اور اپنی جان و مال اس پر قربان کرنے لگا اور چند ہی دنوں میں کسی کو احساس بھی نہ رہا کہ ہم میں برسہا برس سے کیسی خوفناک اور خونیں لڑائی ٹھنی ہوئی تھی۔ اس طرح اسلام نے ان وحشیوں اور قاتلوں میں محبت و اخوّت کی روح اجاگر کر دی اور اجتماعی نظم و ضبط پیدا کر دیا کہ وہ ساری تفریقیں چاہے وہ خطہ اور فرقہ پرستی کی ہوں، زبان کی ہوں، قوم و قبیلہ کی ہوں، رنگ و نسل کی ہوں، غریب و امیر اور حاکم و محکوم کی ہوں، سب مٹ کر فنا ہو گئیں۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز!

غلام جو اس سے پہلے اپنے آقاؤں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے رہتے تھے۔ اسلامی عدل و انصاف نے انہیں امن و حفاظت کی ایک نئی زندگی عطا کر دی اور ہر قسم کی ترقی اور آزادیِ فکر و عمل کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے اور ہر شخص یہ احساس کرنے

لگا کہ وہ ایک ایسی عظیم طاقت کے زیر احتساب ہے جس سے ٹکر لینا اس کے بس میں نہیں ہے۔

سرورِ کائنات کی دعوتِ حق سے قبل کون نہیں جانتا کہ ہر طرف لوٹ اور ڈکیتیوں کا دور دورہ تھا جس کے پاس طاقت تھی اور اس کی حمایت کرنے والے لوگ موجود تھے وہ جو چاہتا تھا اور جہاں چاہتا تھا ظلم ڈھاتا رہتا تھا اور کوئی شخص بھی اس سے پوچھ گچھ نہیں کر سکتا تھا مگر حضورِ انور نے جب اسلام کا پیغام انہیں سنایا اور انسانی خون کی اہمیت سے آگاہ کیا تو پھر وہی خونخوار انسانی درندے رحم و کرم اور ہمدردی و انصاف کے فرشتے بن گئے۔ حضورِ انور نے انہیں بتایا کہ ایک مسلمان ہی نہیں بلکہ ایک آدمی خواہ وہ کوئی بھی دین و مذہب رکھتا ہو اور کسی بھی ملک اور نسل و زبان اور رنگ سے تعلق رکھتا ہو حضرت آدم علیہ السّلام کی اولاد ہے اور ایک دوسرے کا انسانی بھائی ہے نہ تو وہ کسی کی ناحق جان لے سکتا ہے اور نہ مال و آبرو پر حملہ کر سکتا ہے۔ جان کے تحفّظ کے ساتھ مال کا تحفظ بھی کیا گیا اور قرآن نے اعلان کر دیا: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرۃ ۱۸۸) تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقہ

پر نہ کھاؤ۔ اس فرمان کی وسعت میں ہر وہ طریقہ داخل ہے جو عقلی، شرعی اور اخلاقی حیثیت سے تعلیم الٰہی اور منشاء ایزدی کے خلاف ہو۔ اقتصادی بے اعتدالی اور ظالمانہ طریقوں سے مال و دولت کی تحصیل اور اس کا استعمال، اجتماعی نظم کو برباد کرنے میں بڑا بنیادی کردار ادا کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔ اس لئے قرآن حکیم نے اُن غلط اور ظالمانہ راستوں پر پورا پورا احتساب قائم کر دیا ہے تاکہ کسی بھی غلط اور حرام طریقہ سے دولت نہ تو بچائی جائے اور نہ اسے خرچ ہی کیا جائے تاکہ انسان کے اجتماعی نظم میں استحصال، چوری، خیانت، حق تلفی وغیرہ کی کوئی بھی گنجائش باقی نہ رہ سکے اور پورا معاشرہ اس زہر سے پاک صاف ہو جائے۔

اجتماعی تحفظ اور نظم و ضبط کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ معاشرہ میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور افراد کے دلوں میں ایک دوسرے کا پاس و لحاظ، ایک دوسرے کی تکلیف اور دکھ درد کا احساس اجاگر کیا جائے جبتک یہ بات نہ ہو گی معاشرہ کا نظم برقرار نہیں رہ سکتا اس لئے سرورِ کائنات نے فرمایا کہ سچا مسلمان صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان اور دوسرے لوگ پوری طرح محفوظ رہیں، اسی طرح کسی

اور موقع پر آپ نے تین بار اللہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ وہ شخص مؤمن نہیں ہے جس کی شرارتوں سے اس کا ہمسایہ محفوظ نہ ہو پھر یہ بھی بتا دیا کہ ہمسایہ کی حد چالیس گھروں تک پیچھے اور اسی طرح چالیس گھروں تک داہنے اور بائیں، ہوا کرتی ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ عام راستہ پر سے ایسی چیزوں کا ہٹا دینا جو لوگوں کی تکلیف کا باعث ہوں بے حد ثواب رکھتا ہے ساتھ ہی یہ بات بھی بتا دی کہ راستہ چلنے والوں میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے اور اسی طرح ہمسایہ میں بھی ملکی غیر ملکی، رشتہ دار یا غیر اور ہم مذہب یا دوسرے لوگوں کا کوئی فرق نہیں ہے یہ تمام تعلیمیں اجتماعی نظم ہی کو برقرار رکھنے کیلئے ہیں کیونکہ جب تک افراد میں اس قسم کے جذبات کی تخلیق نہ کی جائے گی معاشرے کا نظام ہمیشہ تباہی کا شکار رہے گا۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ دنیا کی مادی طاقتیں خواہ وہ کتنی ہی مضبوط اور مستحکم ہوں کردار کی اصلاح نہیں کر سکتیں، سولی پر لٹکایا جا سکتا ہے، خون بہایا جا سکتا ہے، ہاتھ پیروں کو لوہے میں جکڑا جا سکتا ہے۔ یہ سب باتیں ہم اپنی مادی قوت سے کر سکتے ہیں۔

لیکن کردار کی اصلاح ان وسیلوں سے نہیں ہو سکتی جو برائیاں دلوں کے اندر اور ان کی گہرائیوں میں جم چکی ہیں انھیں ان مادی طاقتوں سے دور نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ کام تو صرف روحانی وسیلوں ہی سے ممکن ہے اور ان ہی ذریعوں سے ہو سکتا ہے جن کا براہِ راست تعلق دلوں سے ہے، احساس سے ہے اور شعور انسانی سے ہے ۔

جن لوگوں کے دلوں میں اللہ کا خوف ہے اور انہیں یقینِ کامل ہے کہ وہ ہمارے ہر پوشیدہ اور ظاہر عمل سے باخبر ہے وہ ہمیشہ برائیوں سے دور رہینگے اور جو لوگ اللہ کا خوف ہی نہیں رکھتے انہیں مادی قوتیں سیاہ کاریوں سے نہیں بچا سکتیں اس لئے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم اپنے دلوں میں دینی شعور کو بیدار کریں اور اللہ کا خوف پیدا کریں تاکہ انفرادی اور اجتماعی خرابیوں سے محفوظ رہ سکیں اور ہماری زندگی کا انفرادی اور اجتماعی ہر پہلو بدنظمی اور تباہی سے بچ سکے ۔

رمضان المبارک اور قرآن حکیم

سورۂ بقرہ (۱۸۳) میں ماہ رمضان المبارک کے متعلق
اللہ نے فرمایا ہے۔
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ ؕ
اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح اُن لوگوں پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ یہ روزے گنتی کے چند روز کے ہیں۔ اس آیت میں اس کا اعلان فرمایا گیا ہے کہ روزے امّتِ مُسلمہ سے قبل دوسری امتوں پر بھی فرض کیے گئے تھے۔

جہاں تک روزہ کی تاریخ کا اندازہ کیا جاتا ہے، دنیا کے عام مؤرخوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی نام سے ہر قوم کے روحانی نظام میں پایا گیا ہے۔ مگر یہاں پر آیت کا اشارہ اور لفظ "کُتِبَ"

کا حقیقی مفہوم صرف اُن ہی قوموں اور امتوں سے متعلق ہے جو اپنے اپنے زمانہ میں کسی نبیٔ برحق کی ماننے والی اور پیروی کرنے والی تھیں ۔ اس حقیقت کے باوجود اس مفہوم کے اس وسیع رُخ میں دنیا کی عام قومیں بھی اُس حد تک ضرور شامل سمجھی جا سکتی ہیں جس حد تک وہ دینِ الٰہی کی عام دعوتِ حق کا مخاطب ہونے کا جواز رکھتی ہیں ۔

غرض یہاں مقصود یہ ہے کہ جس طرح گزشتہ انبیاءؑ و مرسلینؑ کے ذریعہ اُن کی امتوں کو روزہ کا حکم دیا گیا تھا اسی طرح رسولِ عربی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی وساطت سے اِس امّت کو بھی اس کا حکم دیا گیا ہے ۔

قرآنِ حکیم کا یہ اعلانِ عام ایسے زمانہ میں جب عالمی تاریخ اور دنیا کی قوموں کے متعلق صحیح اطلاعات کی فراہمی کا کوئی باضابطہ نظام موجود نہ تھا، جب انسانی تمدّن و تہذیب کی تاریخ رنگین فسانوں اور دلچسپ قصّوں اور کہانیوں کے روپ میں چھپی ہوئی تھی، اور اُس وقت کوئی ایسی بات کہہ دینا جسے انسانی تاریخ کا کوئی دور جھٹلا نہ سکے کسی بشری مخلوق کیلئے ممکن ہی نہ تھا ۔ یقیناً اس حقیقت کا مکمل ثبوت ہے کہ یہ جو کچھ

بھی کہا گیا ہے کہ وحیِ الٰہی ہے اور انسانی علم و فکر کی دسترس سے قطعی طور پر بالاتر ہے۔ چند سطروں کے بعد پھر رمضان کے مہینہ کا ذکر فرمایا گیا ہے:۔ (بقرہ/۱۸۵)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ؕ

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اُتارا گیا جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کے لئے اور حق و باطل میں فرق کرنے کے لئے روشن دلیلیں ہیں۔ اس طرح ماہ رمضان المبارک کی چند خصوصیتوں میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قرآن حکیم کے نزول کی ابتداء ہوئی یا پھر بعض مفسروں کی تشریح کے مطابق لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر پورے قرآن کا اسی ماہ میں نزول ہوا تھا جس کے بعد بہ تدریج تقریباً تیئیس برس میں حضرتِ جبریل علیہ السّلام کے توسط سے سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم پر اس کا نزول ہوتا رہا۔ بہر صورت کل قرآن ہو یا سورۃ العلق کی ابتدائی آیات ہوں۔ ماہِ رمضان ہی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں نزولِ قرآنِ حکیم کی ابتداء ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں رمضان ہی وہ مبارک مہینہ ہے جس میں ہدایت و رہنمائی کا وہ

الہٰی منشور عطا ہوا ہے جس میں قیامت تک کے لیئے تمام عالم بشری کی نجات اور فلاح کی مکمل ضمانت موجود ہے اور انسانی شعور وادراک کو ایسی بنیادیں تعلیم دی گئی ہیں جن سے وہ بڑی آسانی کے ساتھ حق اور باطل، ضلالت و ہدایت اور خیر و شر میں فرق کر سکتا ہے۔ دوسرے اسباب و وجوہ کے علاوہ اس ماہِ مبارک کی یہ خصوصیت اور اہمیت بھی اس بات کا ایک بڑا سبب ہے کہ اس پورے مہینہ کے روزے فرض کر دیئے گئے اور اس کا اعلان فرما دیا گیا کہ وہ ایّام معدودات یعنی چند روز جن میں روزہ رکھنے کا پہلی آیت میں فرمان عطا ہوا تھا اس سے مراد پورا ماہ رمضان ہے فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ط (البقرۃ) یعنی جو شخص اس مہینہ میں حاضر ہو اس کے لیئے لازم ہے کہ وہ اس پورے مہینہ میں روزے رکھے۔ اس کے بعد یہ بھی بتایا گیا ہے کہ: وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ط اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں سے روزوں کی تعداد پوری کرے۔ ماہِ رمضان المبارک کی دوسری بنیادی خصوصیت جسے قرآنِ حکیم نے بتایا ہے وہ یہی ہے کہ اس پورے مہینہ کو انسانی روح کی تطہیر کے لیئے خاص طور پر معین فرمایا گیا ہے تاکہ اس میں اللہ کے

تعلیم دیئے ہوئے مخصوص طریقہ پر دن بھر بھوکا اور پیاسا رہ کر اور خواہشاتِ نفسانی پر بہت سی پابندیاں لگا کر آدمی اپنے نفس اور اپنے شعور و کردار سے برائیوں کی جڑیں کاٹ سکے اور پاکیزگیِ روح و جسم کے ساتھ وہ مقام حاصل کر سکے جس کا وہ اس کائنات میں حقدار بنایا گیا ہے — اسی بات کی طرف بڑے جامع انداز میں پچھلی آیت کے اس جملہ میں اشارہ ہے "لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" یہ روزے اس لیئے فرض کیئے گئے ہیں کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کا اصلی مفہوم یہی ہے کہ انسان تزکیۂ نفس اور تطہیرِ روح کے وسیلہ سے اپنا صحیح مقام حاصل کر لے، بدی اور معصیت کی جڑیں اس کے احساس و شعور کی گہرائیوں سے اکھاڑ دی جائیں اور ایمان و طاعت و بندگی کی وہ تمام صلاحیتیں اجاگر ہو جائیں جن سے انسان کے صحیح مقام اور انسانیت کے اصلی مرتبہ کا تعین ہو سکتا ہے۔

غرض قرآنِ حکیم نے ماہِ رمضان کی اہمیت کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ خیر و برکت اور ہدایت و رحمت کا مہینہ ہے اور اس سے بہتر پورے سال میں کوئی اور زمانہ ایسا نہیں ہے جس میں انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی برائیوں کی اصلاح اور روحانی، اخلاقی اور مادی اچھائیوں کی تحصیل اس طرح کر سکے

جس طرح اِس میں کر سکتا ہے ۔ بڑے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اللہ کے عطا کیئے ہوئے اس چشمۂ فیض و رحمت سے فائدہ نہیں اٹھاتے ۔ اور انتہائی خوش قسمت ہیں وہ انسان جو اس ماہِ مبارک کی عظیم برکتوں سے فیضیاب ہو کر دنیا کی فلاح اور آخرت کی نجات اور اپنے مالک و خالق اللہ کی رضامندی اور خوشنودی کے مستحق بن جاتے ہیں ۔

مجتہدِ اعظم سیّد دلدار علی غفراں مآب رح

بارھویں صدی ہجری کے علمی آسمان کا تابناک سورج

میرے ننھیال یعنی خاندانِ اجتہاد کیطرف سے میرے جدِ معظم آیۃ اللہ العظمیٰ حضرت السیّد دلدار علی غفراںمآب رح جن کی ذاتِ گرامی کی طرف لکھنؤ کا مشہور خاندانِ اجتہاد منسوب ہے ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۲ء) قصبہ نصیر آباد ضلع رائے بریلی یوپی میں پیدا ہوئے اور تقریباً ستّر سال کی عمر پاکر ۱۲۳۵ھ (۱۸۱۹ء) میں اودھ کے دارالسلطنت لکھنؤ میں وفات پائی۔

آپ کا سلسلہ نسب تیئیس ۲۳ واسطوں سے حضرت امام علی نقی علیہ السلام تک منتہی ہوتا ہے۔ بنی عباس کے دورِ حکومت میں آپ کے اجداد میں سے ایک بزرگ ابو طالب حمزہ نے ایران کی طرف ہجرت کی اور شیراز میں مقیم رہے اُن کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند سیّد محمد سبزوار میں متوطن ہوئے۔

ان ہی ابوالعُلیٰ محمدؒ کے پوتے سید نجم الدین۔ سالار مسعود غازی کے ہمراہ سردار لشکر بن کر ہندوستان آئے یہ ۹۹۹ء کے بعد کا زمانہ تھا جب محمود غزنوی کے سرزمینِ ہند پر حملے ہو رہے تھے۔

سید نجم الدین ہی ہندوستان میں حضرت غفرانمآب کے مُورث اعلیٰ تھے۔ اسی نامور سردار لشکر نے ودیا نگر کے مشہور قلعہ کو فتح کیا تھا اور اس جگہ کا نام جائے عیش قرار دیا جو بعد میں جائس کے نام سے مشہور ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اسی نسل کے ایک بزرگ سید زکریا بن خضر نے قریب کی ایک ریاست پٹاک پور کو فتح کر کے اس قصبہ کا نام نصیر آباد رکھا۔ سادات کا یہ گھرانا جائس اور نصیر آباد میں علمی ضیا پاشیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا جس کی شعاعیں اس برِّ صغیر میں دور دور تک پھیل رہی تھیں اس خاندان کے ایک بزرگ فرد سید عبد القادر کو اورنگ زیب نے ولی عہد کی تعلیم پر معیّن کیا تھا۔ یہ ولی عہد جو بعد میں بہادر شاہ بنے غفران مآب کے جد سیّد عبد القادر کی تربیت و تعلیم کے مرہون منّت تھے۔

مجتہد اعظم حضرت سید دلدار علیؒ کی ابتدائی تعلیم رواج کے مطابق مقامی طریقہ پر ہوئی۔ دیہات کی زندگی کے لیئے کھیتی باڑی کا مشغلہ بھی ضروری تھا۔ اس مشغلہ نے آبادی کے باہر کھیتوں اور باغوں کی سنسان فضاؤں کو اس بچہ کا جو آئندہ غفرانمآب بننے والا تھا مکتب فکر و نظر بنا دیا تھا ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ وہ اپنے ایک کھیت پر مویشی لیئے اپنے کاموں میں مشغول تھے چاروں طرف درختوں کے جھنڈ تھے اور یہ گھنی شاخوں کے سایہ میں کائنات کی گہرائیوں کا مطالعہ کر رہے تھے یکایک ان ہی گہرائیوں سے ایک آواز آئی!

— دلدار علی لکھنؤ جاؤ اور تحصیل علم کو جاری رکھو

— اس غیبی آواز میں ایک عجیب انقلابی تاثیر تھی جو برق کی لہروں کی طرح اس بچہ کے دل میں دوڑ گئی اور سارا خاندان اس حیرت انگیز واقعہ سے بے انتہا متاثر ہوا۔ زراعت پیشہ ماں باپ نے اپنے چہیتے بیٹے کی مفارقت گوارا کر لی اور لکھنؤ بھیجنے پر تیار ہو گئے۔ حضرت سید دلدار علی نے ابتدائی کتابیں رائے بریلی کے مولوی باب اللہ سے

پڑھیں پھر سندیلہ پہنچکر ملّا حیدر علی کے درس میں شریک ہوئے اور فلسفہ کی تعلیم کو مکمل کیا۔

غربت وافلاس کا یہ عالم تھا کہ رات کو کتب بینی کے کئے اپنا ذاتی چراغ نہ تھا بلکہ سڑک کے سرکاری چراغ کی روشنی یا کسی دوکان کی ٹمٹماتی ہوئی شمع کی روشنی میں کتاب دیکھا کرتے تھے۔

اودھ کے مشہور حکمران نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ پہنچے اور درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔ حکومت اودھ کی مدد سے آپ نے عراق کا سفر اختیار کیا۔ اُس زمانہ میں آجکل کی سی سہولیتں نہ تھیں مہینوں میں اس صبر آزما سفر کی سختیاں تحمیل کر غفرانمآب نجف اشرف پہنچے اور تکمیل علوم میں مصروف ہو گئے۔ مشہور ہے کہ کئی ماہ میں بادبانی جہاز نے بصرہ کے قریب پہنچا یا تھا کہ بادِ مخالف کے جھونکوں نے بمبئی کے ساحل پر پھر لا کھڑا کیا۔ مگر وہ ہمت نہ ہارے اور سمندر کی طوفانی موجیں اور بادِ مخالف کے تھپیڑے ان کے ناقابل تسخیر عزم کو شکست دینے میں کامیاب نہ ہو سکے اور دوسری کوشش میں آپ بصرہ پہنچ گئے

یہ غفران مآبؒ نہ تھے بلکہ فاطمی نور کا ایک ٹکڑا تھا جو خطۂ ہند سے اپنے مرکز کی طرف پلٹ رہا تھا۔ نجف اشرف پہنچکر آپ نے وہاں کے اساطین دین اور محققین مذہب سے تحصیل علم اور تکمیلِ درس کا سلسلہ شروع کیا۔ نجف میں پانچ سال رہ کر ہندوستان واپس ہوئے۔

علاّمہ کنتوری طاب ثراہ نے لکھا ہے کہ میرے ایک بزرگ حضرت غفرانمآبؒ کے ہمسفر تھے۔ نجف اشرف میں شبِ قدر کے اعمال کئے اور اُن کو بھی شریک کیا اور فرمایا کہ جب ایک عمود نور قُبّہ حضرت امیر المومنینؑ سے آسمان تک ظاہر ہو تو وہی قبولیت دعا کا وقت ہے۔ جب وہ وقت آیا اور نور ظاہر ہوا تو جناب غفرانمآبؒ نے دعا کی :۔ خداوندا! اس صاحبِ قبر کا واسطہ میری اولاد سے قیامت تک علم دین نہ جائے۔ بعض مقامات پر نجف اشرف کے بجائے روضۂ حضرت امام حسینؑ کا ذکر ہے۔ سالہا سال کی جانفشانی اور غریب الوطنی کے بعد لکھنؤ واپس ہو گئے اور نواب آصف الدولہ کی استدعا پر لکھنؤ ہی میں قیام فرمایا آپ سلطنت کی سیاسیات سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور اپنی پوری زندگی ترویج دین

اور تصنیف و تدریس میں صرف کر دی۔

حضرتِ غفرانمآبؒ کی تصنیفات کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ہر علم و فن میں آپ نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ حرف آخر ہے۔ حضرت موصوف نے علم کلام میں کتاب عماد الاسلام کی پانچ ضخیم مجلدات تحریر فرمائیں جن میں سے تین پہلی جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

جلد الٰہیات میں حکمائے یونان، فلاسفۂ اسلام اور محققین اُمّت کے اقوال پر معرکہ آرا بحثیں درج ہیں جن کو دیکھ کر حضرت غفرانمآبؒ کے دریائے علم کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ علم کلام میں اس سے بہتر اور جامع کتاب اب تک اسلامی کتب خانوں میں نہیں پائی جاتی۔

لکھنؤ میں نماز جمعہ کی ابتداء آپ ہی کے دور سے ہوئی بلکہ ہندوستان بھر میں نماز جمعہ پڑھانے کی ابتداء آپ ہی سے ہوئی تھی۔ نماز کے بعد آپ موعظہ بیان کرتے تھے۔ شرکت کے لیئے عوام کے علاوہ وزرائے سلطنت حکّام اور کبھی خود نواب آصف الدولہ شاہِ اودھ بھی آتے تھے مگر غفرانمآبؒ نے احکامِ خدا کے بیان کرنے میں اور

تبلیغ حق کے فرائض انجام دینے میں کبھی کسی شخص کی پروا نہ کی اور ہمیشہ وہی بات کہی جس کو وہ حق سمجھتے تھے۔ آپ کے موعظوں سے متاثر ہو کر خود لو آب اودھ نے بھی بہت باتیں ترک کر دیں جن کے وہ عادی تھے۔

اُن کی کوشش اور حکومت کے تعاون سے ایک عظیم الشان کتبخانہ قائم ہوا جس میں ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔ اُن کی مجلس درس سے سیکڑوں طلبہ فیضیاب ہوتے تھے۔

جناب غفرانمآب نے مسلمانوں کی اخلاقی سطح کو بلند کرنے، غلط اور خلاف اسلام رسموں اور اعتقادات کو مٹانے اور ان کی اصلاح کرنے میں جو قیمتی خدمات انجام دیں اُن کی مثال صدیوں کی تاریخ میں بھی دستیاب نہیں ہو سکتی۔

وہ ایک فرد یا ایک تنہا معلّم نہ تھے بلکہ ان کی گوناگوں شخصیت مختلف علمی، ثقافتی اور اصلاحی کمالات کا مرکز تھی وہ ایک چلتا پھرتا مدرسہ اور ایک متحرک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتے تھے جو تنہا اپنے شاگردوں کو تمام علوم کی تعلیم دے کر جیّد عالم بنا دیتے تھے۔ ان کے سارے شاگرد ان کی سیرت و کردار کا آئینہ تھے اور تبلیغ اسلام کے عظیم مقصد میں اُن کے

شریک تھے۔ برّ صغیر ہند کے گوشہ گوشہ میں انھوں نے اپنے شاگردوں کو اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے بھیجا اور جسے جہاں روانہ کر دیا وہ بغیر زاد و راحلہ اپنا سارا گھر بار چھوڑ کر روانہ ہوگیا اس طرح ملک کے بعید مقامات پر دور و دراز جنگلوں میں عام شہری آبادیوں سے طولانی فاصلوں پر آپ کے مبلّغین اور شاگرد ہتھیلی پر سر رکھ کر پہنچ گئے اور پیغامِ الٰہی اور دینِ محمدیؐ کی تبلیغ میں مصروف ہوگئے۔

حضرت غفرانمآبؒ سید دلدار علی طاب ثراہ سرزمینِ ہند پر وہ پہلے مُصلح تھے جنہوں نے اسلامی تبلیغ کے کام کو ایک تنظیمی روح عطا کی عوام کے دلوں میں بادشاہوں، حاکموں اور رئیسوں کی خوشامد اور خوف کے بجائے دین کی عظمت اور خدا کا خوف اجاگر کیا اور اُن کے کردار اور ذہن کو غیر اللہ کی پرستش اور مُلحدانہ رسم و رواج کی گندگی سے پاک کر دیا۔ وہ بارھویں صدی ہجری کے عظیم ترین متفکّر، مُصلح اور مجدّدِ اعظم تھے۔ سیّد دلدار علی غفرانمآبؒ اُن بے لوث اور پرہیزگار علماء کے سرخیل تھے جنہوں نے ہزاروں وسائل و اسباب کے باوجود کبھی دنیاوی اِمارت و ریاست

کی طرف نظر اٹھا کر کبھی نہ دیکھا ان کا خیال تھا کہ نائب امامؑ اور حاکم دین کے لیئے رئیسوں اور حاکموں کی درباداری کرنا منصبِ نیابتِ امامؑ کی توہین ہے اور اُن مشغلوں میں کمی بلکہ اُن کی بربادی اور تباہی کا باعث ہے جو اس عہدے کے فرائض میں داخل ہیں حضرت غفرانمآبؒ نے نوّاب آصفُ الدّولہ کا آخری دور اور نوّاب سعادت علی خاں کی پوری زندگی دیکھی۔ درباداریاں اور سیاسی جوڑ توڑ قوموں کے کردار میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں مگر اس عالمِ ربّانی کی سیرت اور اُن کا پاک ضمیر سیاسی اُتار چڑھاؤ اور سیم و زر کی جلبیوں سے متاثر نہ کیا جا سکا۔ اُن سے دربارِ شاہی میں بھی بارہا لوگوں کے ساتھ علمی بحثیں ہوئیں مگر حضرت سید دلدار علیؒ نے کبھی کسی مسئلہ کا حکومت سے ڈر کر جواب نہ دیا اور جو حق بات تھی وہی کہی وہ نہ کبھی بادشاہوں سے ڈرے اور نہ کبھی حاشیہ نشینوں سے مرعوب ہوئے۔ ایک مرتبہ نوّاب آصفُ الدولہ مرحوم نے کئی لاکھ روپیہ امورِ خیر میں صرف کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اودھ کے وزیرِ اعظم سرفراز الدولہ نے یہ رقم حضرت غفرانمآبؒ کو

دلوانا چاہی تاکہ اُن کے ہاتھوں صرف کیجائے۔ وزیرِ اعظم کی تحریک پر نواب آصفُ الدّولہ نے علامہؒ کو اپنے پاس بلوا کر مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس رقم سے کربلا و نجف کے درمیان ایک نہر بنوا دیجئے وہاں کے لوگوں کو پانی کی بہت تکلیف ہے اس طرح کربلا کی نہر آصفی حضرت غفرانمآبؒ کے مشورے کے مطابق بنائی گئی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے نوّاب آصف الدّولہ نے وزیرِ اعظم سے کہا کہ میں اپنے ولیعہد کی شادی کسی سیّد زادی کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں سرفراز الدّولہ نے رائے دی کہ حضرت غفرانمآبؒ کی صاحبزادی سے بہتر آپ کے بیٹے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیئے کوئی دوسرا رشتہ نہیں ہو سکتا۔

بادشاہ کو یہ رائے بہت پسند آئی۔ وزیرِ اعظم خوشی خوشی حضرت غفرانمآبؒ کی خدمت میں گئے اور انھیں یقین تھا کہ وہ بھی اس خبر سے خوشی کے مارے پھولوں نہ سمائیں گے مگر وزیرِ اعظم کی حیرت کی حد نہ رہی جب غفرانمآبؒ نے سخت ناگواری کا اظہار کیا

اور فرمایا کہ اہل دنیا سے ہمارا پیوند مناسب نہیں۔ وزیر اعظم نے عرض کیا کہ اب تو میں وعدہ کر چکا ہوں اور بادشاہ بھی اس رشتہ کو پسند کر چکے ہیں یہ سن کر حضرت غفرانمآبؒ نے فوراً ایک سانڈنی سوار اسی وقت نصیر آباد روانہ کیا اور اپنے ایک قریبی عزیز کے لڑکے کو بلوا کر دوسرے روز ہی صاحبزادی کا اُن کے ساتھ نکاح کر دیا اور جب دربار شاہی سے پیام آیا تو کہلا دیا کہ لڑکی کا نکاح ہو چکا ہے۔

برِصغیر پاک وہند کے چپہ چپہ پر حضرت غفرانمآبؒ کی دینی کاوشوں کا احسانِ عظیم ہے اور آج تک ان کی اولاد بھی ان کی مبارک و مسعود دعا کے مطابق دینِ خدا کی خدمت و ترویج و تبلیغ میں مصروف ہے۔ لکھنؤ کا مشہور ترین امام بارہ جو حسینیہ غفرانمآبؒ کے نام سے مشہور ہے آپ کا مدفن ہے اس امامبارہ میں سیکڑوں علماء و فقہاء دفن ہیں اور ہر شخص اس خطۂ پاک میں دفن ہونا اپنی سعادت سمجھتا ہے۔

آج کا دن

۲ محرم ۶۱ھ کو امام حسینؑ اور آپ کے رفقا کربلا میں خیمہ زن ہوئے

محرم سنہ ۶۱ھ کی دوسری تاریخ تھی جیسا کہ تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے جب امام حسین علیہ السلام اور آپ کے گھر والے اور انصار اور تمام ساتھی خطۂ کربلا میں تشریف لائے۔ جب امامؑ عالی مقام اس زمین پر پہنچے تو آپ کی سواری کا گھوڑا خود بخود ٹھہر گیا اور کسی طرح بھی اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی۔ یہ دیکھ کر آپ نے دوسرا گھوڑا طلب کیا اور اس پر سوار ہو گئے مگر وہ بھی آگے نہ بڑھا۔ لوط بن یحییٰ ابو مخنف کی روایت کے مطابق امامؑ عالی مقام نے سات گھوڑے بدلے مگر کسی ایک نے بھی اس جگہ سے آگے قدم نہیں بڑھایا اس وقت جب

تمام لوگوں نے گھوڑوں کے اس حیرت انگیز حال کو دیکھ لیا تو امام حسینؑ اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہوئے اور دریافت کیا کہ اِس سرزمین کا نام کیا ہے۔ یہ بھی ایک خاص اندازِ کلام تھا ورنہ آپ خوب واقف تھے کہ یہ کونسا خطۂ زمین ہے۔ امام علیہ السلام جس گھوڑے پر پہلے سوار تھے اُس کا نام "مُرتَجِز" تھا اور وہ سرور کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی سواری کا گھوڑا تھا۔ غرض آپ نے سوال فرمایا کہ اس سرزمین کا نام کیا ہے۔ لوگوں نے عرض کی فرزندِ رسولؐ اس کو "غاضِرِیَّہ" کہا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس نام کے علاوہ کیا اس کا کوئی دوسرا نام بھی ہے؟ جواب میں عرض کیا گیا اس کو "نینوا" بھی کہتے ہیں۔ فرمایا کوئی اور نام؟ لوگوں نے عرض کی حضور! ایک نام "شَطُّ الفُرات" بھی ہے۔ آپ نے پھر فرمایا۔ ان ناموں کے علاوہ اِس کا کوئی اور نام بھی ہے؟ لوگوں نے عرض کی فرزند فاطمہؑ! اسی سرزمین کا ایک نام "کربلا" بھی ہے۔ یہ سنکر امامؑ عالی مقام نے ایک آہِ سرد کھینچی اور فرمانے لگے "اَرضُ کَربٍ وَّبَلاءٍ" یہی زمین مصیبتوں اور امتحان و آزمائش کی جگہ ہے۔

"قِفُوْا وَلَا تَرحَلُوْا مِنْهَا "۔ اب تم لوگ یہاں پر ٹھہر جاؤ اور آگے نہ بڑھو۔ اللہ جلّ شانہ کی قسم! یہی وہ جگہ ہے جہاں ہمارے خیمے لگائے جائیں گے، یہیں ہمارے خون بہائے جائیں گے، یہیں ہمارا گھر تاراج ہوگا اور ہمارے مرد شہید کیئے جائیں گے ہمارے بچے ذبح ہوں گے، یہیں ہماری قبریں بنیں گی اور دُور دُور سے لوگ اُن کی زیارت کو آئیں گے اور اسی سرزمین کا ذکر مجھ سے میرے نانا رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم فرما گئے ہیں۔ امام حسینؑ گھوڑے سے اترے اور خیمے لگانے کا حکم دیا۔ اہلِ نینوا اور اہلِ غاضریہ کو طلب کیا، انکو نصیحتیں کیں اور اُن سے اس خِطّۂ زمین کو ساٹھ ہزار درہم یا دینار میں خرید لیا اور پھر اُن ہی کو واپس بھی دے دیا۔ تین شرطوں کے ساتھ کہ وہ قبورِ شہداء کی دیکھ بھال نہیں کریں گے اور ہمارے تمام زائروں کو قبروں کے نشانات بتایا کریں گے اور تین روز تک زائروں کو مہمان رکھا کریں گے۔

یہ خِطّہ جو امامؑ نے خریدا تھا چار میل مربع تھا۔ اس کے ساتھ ہی امام حسین علیہ السّلام نے اُن لوگوں کو حکم دیا

کہ تم ہماری قبریں بھی بنانا۔ پھر اُن کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ بچوّ! یہاں ہم شہید کئے جائیں گے۔ تم بھی خیال رکھنا۔ اگر تمہارے ماں باپ عُبیدؔ اللہ بن زیاد والیِ کوفہ کے خوف سے ہمیں دفن نہ کریں تو تم ہمیں دفن کر دینا اور اپنے ننھے ہاتھوں سے ہماری لاشوں پر مٹی ڈال دینا اور انھیں زمین میں چھپا دینا۔ یہ سنتے ہی تمام لوگ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ چنانچہ وصیّت اور حکم امامؑ کی تعمیل میں غاضِریّہ و نینوا کے مزدوروں کسانوں اور محنت کش غریبوں نے امام حسین علیہ السلام اور آپ کے انصار و اقربا کی مقدس لاشیں شہادت کے تیسرے روز یعنی ۱۲ محرم کو سپردِ خاک کر دیں اس طریقہ پر جس کی ہدایات اُن کو حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے حاصل ہوئی تھیں اور اُس تفصیل کے ساتھ جیسے کُتُبِ مقاتل میں بیان کیا گیا ہے۔

آج کا دن

شہادت حسینؑ اور واقعۂ کربلا

آج عاشور محرّم ہے اور یہ وہی یادگار تاریخ ہے جب نواسۂ رسول اسلام حضرت امام حسین علیہ السلام نے کربلا کے میدان میں اللہ کے دین اور روح حق و دیانت کو بچانے کے لیئے اپنی اور اپنی اولاد اور اپنے اصحاب و انصار کی جانیں قربان کی تھیں اور تین روز کی بھوک اور پیاس کے باوجود صبر و استقامت اور جرأت و شجاعت کی وہ بلند ترین مثال پیش فرمائی تھی جس کی روشنی سے قیامت تک پوری انسانیت اور ساری دنیا رہنمائی حاصل کرتی رہے گی۔ آپ نے اپنی سیرت اور اپنے عمل سے اس حقیقت کو آشکار کر دیا کہ سچا مرد مومن وہی ہوتا ہے جو مصیبتوں کے طوفان میں گھر کر بھی جادۂ حق سے کبھی قدم نہ ہٹائے اور اس کے پائے استقامت

میں لغزش پیدا نہ ہوسکے۔

کربلا کا چٹیل میدان ہے، کربلا کی دھوپ ہے، گرم ریت کے ذرّے آگ کی چنگاریوں کی طرح دہک رہے ہیں، دور دور تک کہیں سایہ اور سبزہ نظر نہیں آتا۔ اسی خوفناک لق و دق ریتیلے میدان کے ایک حصّہ میں نہر فرات بہہ رہی ہے اور اس کے قریب ہی سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی بھوکی اور پیاسی اولاد کے خیمے نصب ہیں جن پر اُداسی اور بیکسی چھائی ہوئی ہے۔

یہاں سے کچھ فاصلہ پر کوفہ کی آبادی ہے جو کربلا سے جنوب کی سمت میں واقع ہے۔ یہی کوفہ وہ مشہور اور تاریخی مقام ہے جہاں کے لوگوں کے بلانے پر امامِ عالی مقام اُن کی ہدایت و اصلاح کے لیئے مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ اور آپ محرم ۶۱ھ میں کربلا کی سرزمین پر تشریف لائے تھے۔ جب آپ مدینہ سے کوفہ کے لیئے روانہ ہوئے تھے تو آپ نے کھلے لفظوں میں اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ میں سلطنت اور تخت و تاج حاصل کرنے کی غرض سے یہ سفر نہیں کر رہا ہوں۔ وَاِنَّمَا خَرَجْتُ

لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِیْ اُمَّۃِ جَدِّیْ" بلکہ میری اصلی غرض صرف یہ ہے کہ میں اپنے نانا محمد مصطفےٰ صلیّ اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی اُمّت کی اصلاح وہدایت کروں۔ محرّم کے نو دن بھی گذر چکے ہیں اور اب تو عاشور کی دوپہر بھی ڈھل چکی ہے۔

سیدالشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کے خیموں کے سامنے بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کی لاشیں زمین پر پڑی ہوئی ہیں جنہوں نے دینِ حق کی حمایت ونصرت کی راہ میں جامِ شہادت نوش کیا ہے۔

امام حسینؑ اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے اپنے بیمار و لاغر بڑے فرزند امام زین العابدین علیہ السّلام سے رخصت ہو کر خیمۂ اقدس سے باہر تشریف لائے اور لشکرِ یزید سے پوچھا: بِمَ تَسْتَحِلُّوْنَ دَمِیْ ؟ بتاؤ! تم نے میرا خون کیوں جائز سمجھ لیا ہے۔ کیا میں نے کسی کو قتل کر دیا ہے، کیا میں نے شریعت میں کوئی تبدیلی کی ہے۔ کیا میں نے قرآن کو بدل دیا ہے؟ آخر میں نے کونسا ایسا گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے تم مجھے قتل کرنا

ضروری سمجھ رہے ہو۔ جواب دو! کیا تم مجھے پہچانتے نہیں ہو۔ اگر تم مجھے نہیں پہچانتے تو سنو! میرا نام حسینؑ ہے میں رسول اللہؐ کا نواسہ ہوں، علیؑ و فاطمہؑ کا بیٹا ہوں حسنِؑ مجتبیٰ کا حقیقی بھائی ہوں اور یہ بات خوب سمجھ لو کہ میں ہرگز تم سے لڑنے نہیں آیا ہوں بلکہ تمہاری دعوت پر صرف تمہاری ہدایت کے لیئے آیا ہوں۔ بتاؤ میری خطا کیا ہے؟

اس حسینی للکار کو سن کر ظالم فوج یزیدؔ لعین کے سر شرم و حیا سے جھک گئے۔ کوئی جواب نہ تھا! سوائے اس کے کہ تیروں کی بارش ہونے لگی بے رحم انسانی درندوں کی تلواریں امام کے جسم اقدس پر برسنے لگیں آخر ان تیروں، نیزوں اور تلواروں نے اپنا کام پورا کر دیا اور اس بوڑھے نیلگوں آسمان نے وہ وقت! وہ قیامت خیز وقت! اور وہ انسانیت کی روح کو تڑپا دینے والا وقت! بھی دیکھ لیا جب حسینؑ مظلوم کا سرِ مطہر یزیدی فوج کے ایک طویل نیزے پر بلند تھا۔ بناتِ سیدۂ عالم سر برہنہ تھیں۔ نواسۂ رسول اللہ کی لاشِ اطہر

بے گور و کفن جلتی ہوئی ریت پر پڑی تھی اور اس پر ظالم فوج اپنے گھوڑے دوڑا رہی تھی اور یہ قیامت کا منظر فرزند رسولؐ کی بہنیں اور بیٹیاں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔

امام حسینؑ کی قربانی اور شہادت اسلام اور قرآن کی ابدی فتح کا نشان ہے۔ ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

کربلا کا ریگستان آگ کی طرح بھڑک رہا ہے، زمین کے ذرہ ذرہ سے شعلے اُٹھ رہے ہیں، نہر فرات کا ریتیلا ساحل دور دور تک پھیلا ہوا ہے جہاں نہ درختوں کا سایہ ہے اور نہ کوئی پناہ کی جگہ۔ نہر سے کچھ فاصلہ پر نواسۂ سرورِ کائنات اور آپ کے پاکباز ساتھیوں کے کچھ خیمے لگے ہوئے ہیں مگر امام حسینؓ اور آپ کے تمام جاں نثار ساتھی بھوک اور پیاس سے نڈھال ہیں۔ سامنے نہر فرات بہہ رہی ہے مگر کوفہ کی بے رحم فوج کے سپاہی نہر پر پہرا دے رہے ہیں تاکہ کوئی شخص بھی ان کی اجازت کے بغیر پانی کی ایک بوند بھی نہ پی سکے۔ اُدھر خیامِ حسینی میں سب کے سب پیاس سے ہلاک ہو رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے سوکھے ہوئے خالی مشکیزے ہاتھوں میں لئے ہوئے اَلْعَطَش اَلْعَطَش کی فریاد کر رہے ہیں۔ مگر اس بلاخیز گرمی، بھوک اور پیاس

کے باوجود اُن میں کوئی بھی یزیدؔ لعین کی اطاعت اور اُس کے طاغوتی لشکر کے سامنے گردن جھکانے کے لیئے تیار نہیں ہے منچلے جوان برہنہ تلواریں لیئے ہوئے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جامِ شہادت پینے کے لیئے بے چین ہیں۔ بوڑھے کمر کسے ہوئے شوقِ جہاد میں تڑپ رہے ہیں۔ مائیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچّوں کو لیئے ہوئے امام عالی مقام کے حکم کی منتظر اور اجازت کے لیئے مضطرب ہیں کہ جلد انھیں راہ حق میں قربانی کے لیئے پیش کر دیں۔ ایک شہید کی لاش آئی اور ابھی اُس کی بیوہ کی آنکھوں کے آنسو خشک بھی نہ ہوئے تھے کہ اس شہید کا ایک بہت کم سِن بچہ کمر میں چھوٹی سی تلوار لگائے ہوئے سید الشہداؑ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور ننھے ہاتھ جوڑ کر میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ امامؑ نے اصحاب سے فرمایا۔ ابھی اس بچہ کا باپ شہید ہوا ہے ایسا نہ ہو اس کی ماں اس کی شہادت پر راضی نہ ہو۔ یہ سنتے ہی اُس بچّہ نے عرض کی: اے ہماری جان و مال کے مالک۔ فرزندِ رسولؐ! میری کمر میں یہ تلوار تو میری ماں ہی نے لگائی ہے اور مجھے میدانِ شہادت کے لیئے سجا بنا کر آپ کی

خدمت میں بھیجا ہے۔ پھر جب یہ آواز اس کی ماں نے سُنی
تو اس نے فریاد کی کہ آقا یہ میرا حقیر ہدیہ ہے اسے واپس نہ
کیجیے۔ فرزندِ علیؑ و فاطمہؑ لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ تم میری
وجہ سے کیوں اپنی جانیں گنواتے ہو۔ میری اجازت ہے
تم مجھے اکیلا چھوڑ کر امن و امان کی جگہ تلاش کر لو اور جدھر
جا ہے چلے جاؤ مگر شمعِ امامت کے پروانے بپھرے ہوئے
شیروں کی طرح جام شہادت پینے پر تلے ہوئے ہیں۔ وُہب
بن عبد اللہ کلبیؓ اپنی دُلھن اور اپنی ماں کے ساتھ لشکرِ حسینیؑ
میں تھے۔ صرف سترہ دن ہوئے تھے ان کی شادی کو۔ وُہب کے
دونوں ہاتھ میدان میں لڑتے لڑتے کٹ گئے۔ اپنے خون
میں زمین پر گر کر لوٹنے لگے۔ یہ دیکھ کر دلھن بھی میدان میں
نکل آئی اور وُہب کی حفاظت کرنے لگی مگر کسی لعین نے اُس شیر دل
خاتون کے سر پر گرز مار کر اسے بھی شہید کر دیا۔ وُہب کا سر
کاٹا گیا ماں درِ خیمہ پر کھڑی شہادتِ پسر کا منظر دیکھ رہی
تھی۔ ظالموں نے بیٹے کا سر ماں کی طرف پھینک دیا۔ اس بہادر
خاتون نے سر کو ہاتھوں پر لے کر سینہ سے لگا لیا خون
بھرے رخسار کے بوسے لیے اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے

لگی - اے میرے مالک! میری اس قربانی کو قبول فرما - پھر اُس سر کو میدان کی طرف پھینک کر کہنے لگی - میں نے جو قربانی اللہ کی راہ میں پیش کر دی اب اُسے واپس نہیں لوں گی -
انصار کی قربانیوں کے بعد بنی ہاشم کی قربانیوں کا سلسلہ شروع ہوا - پھر وہ وقت بھی آ گیا جب بنت مرتضیٰؑ حضرت زینبؑ کے فرزند عونؑ و محمدؑ میدان میں آئے اور دونوں زخمی ہو کر زمین پر گرے - امام حسینؑ بھانجوں کی لاشوں کو لیئے ہوئے خیمہ کی طرف آ رہے ہیں - عباسؑ بھی ساتھ ہیں علیؑ اکبر بھی ہمراہ ہیں - سیدۂ عالم حضرت فاطمۃ الزہراؑ کی بوڑھی کنیز فضہؓ دوڑتی ہوئی شاہزادی کے پاس آئی اور قدموں پر سر رکھ کر بولی - میری شاہزادی آپ کے فرزند مارے گئے - زینبؑ نے آسمان کو دیکھا اور سر سجدۂ خالق میں جھکا دیا اور درگاہ خدا میں عرض کی میرے اللہ تیرا شکر کہ میں سرخرو ہو گئی - میرے بھائی کے قدموں پر میری کمائی نثار ہوئی -

ایک وقت وہ بھی آیا جب امامؑ حسینؑ کا ۳۲ برس کا شیر دل بھائی ابوالفضل العباسؑ میدان میں آیا اور ایک ہی حملہ میں ٹڈی دَل لشکرِ ابن سعد کی صفیں توڑ ڈالیں اور

نہر میں گھوڑا ڈال دیا۔ مگر جب مشک سکینہؑ نہر سے بھر کر خیمہ کی طرف جانے لگے تو پورے لشکر نے تیروں، تلواروں اور نیزوں سے حملہ کر دیا علیؑ کا بہادر فرزند زخمی ہو کر گھوڑے سے گرا۔ علمدار لشکر حسینی کو گرتے ہوئے دیکھکر امام حسینؑ نے اپنی کمر تھام لی اور فرمایا! عباسؑ تمہارے مرنے نے میری کمر کو توڑ دیا۔

پھر اس بوڑھے سورج نے وہ جانکاہ سماں بھی دیکھا جب امام حسینؑ کا اٹھارہ برس کا حسین ترین فرزند علی اکبرؑ میدان میں آیا۔ امامؑ نے آسمان پر نظر فرمائی اور درگاہِ خداوندی میں عرض کی۔ اے میرے پروردگار تو گواہ رہنا کہ اب میدان کارزار میں میرا وہ خوبصورت بیٹا جا رہا ہے جو تیرے رسولؐ کی ہو بہو تصویر ہے۔

علیؑ اکبر نے بے پناہ جنگ کی مگر کسی ظالم نے چھپ کر برچھی کا وار کیا اور شاہزادہ تیورا کر زمین پر گرا۔ ماں حضرت لیلیٰ اور پھوپھی حضرت زینبؑ خیمہ کے دروازہ پر کھڑی ہیں۔ امامِ عالی مقام نوجوان کی لاش پر آگئے۔ علیؑ اکبر اپنے خون میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں

بوڑھے باپ نے جانِ شباب بیٹے کے رخسارہ پر اپنا رخسارہ رکھ دیا اور آسمان کی طرف رُخ کرکے آواز دی اے میرے چاند! تیرے بعد اب اس دنیا کی زندگی پر خاک ہے۔

آیۃ اللہ العظمیٰ حجۃ الاسلام

شمس العلماء

حضرت سید نجم الحسن مجتہدِ اعظمؒ

میرے جدِ مرحوم برِصغیر پاک و ہند کے نامور مجتہد حجۃ الاسلام شمس العلماء آیۃ اللہ العظمیٰ حضرت علامہ سید نجم الحسنؒ بیسویں صدی عیسوی کے عظیم روحانی رہنما، محقق، محدث، مفسر، فقیہہ، فلسفی، ادیب اور ماہر علم ہیئتِ قدیم تھے۔ آپ کا اصلی وطن امروہہ ضلع مراد آباد (یوپی) تھا۔ ۶ ذی الحجہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۲۶ مئی ۱۸۶۲ء روز دوشنبہ اپنے وطن میں پیدا ہوئے اور یکشنبہ ۱۷ صفر ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۶ مارچ ۱۹۴۱ء کو لکھنؤ میں بعمر ۸۰ سال وفات پائی۔ سرکارِ موصوف ساداتِ رضویہ (تقویہ) میں سے تھے۔ آپ کا

نامور سلسلۂ نسب شیر خدا حضرت علی علیہ السلام تک انتالیس (۳۹) واسطوں سے منتہی ہوتا ہے۔

حضرت نجم العلماء کے اجداد میں سید میراں ایمور آ، سید اشرف دانشمند، سید زید شہسوار اور سید عبداللہ زر بخش جیسی یادگارِ زمانہ شخصیتیں گذری ہیں۔ حضرت ممدوح نے امروہہ میں ابتدائی درسیات کی تکمیل فرمائی پھر لکھنؤ کا سفر کیا اور وہاں کے مشاہیر علماء سے اکتساب علم کیا۔ اپنے تمام اساتذہ میں مرحوم کو جس عظیم ہستی سے خصوصی طور پر تلمذ کا شرف حاصل ہوا اور علمی فیوض و برکات ملے وہ حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ حجۃ الاسلام شمس العلماء علامہ مفتی سید محمد عباس شوستری مفتی اعظم سلطنت اودھ تھے جن کی صاحبزادی سے آپ کا عقد بھی ہوا اور علامہ شوستری کی وفات کے بعد آپ اُن کے جانشین قرار دیئے گئے۔ آپ کی علمی یادگار آپ کے قیمتی تصانیف ہیں جن میں سے بعض طبع ہو چکی ہیں اور بیشتر طبع نہ ہو سکیں اور قلمی نسخوں کی صورت میں باقی رہ گئیں۔ ان تصانیف کے علاوہ آپ متعدد جدید و قدیم درسگاہوں

کے منتظم اعلیٰ اور بانی بھی تھے جن میں ناظمیہ عربی کالج لکھنؤ، مدرستہ الواعظین لکھنؤ، شیعہ ڈگری کالج لکھنؤ اور نورالمدارس، امام المدارس انٹر کالج (امروہہ) بھی شامل ہیں۔ آپ نے ایک نادر کتب خانہ بھی چھوڑا جس میں مختلف علوم و فنون کی مطبوعہ اور قلمی ہزارہا کتابیں موجود ہیں۔

حضرت سیّد نجم الحسن رحمۃ اللہ علیہ بڑی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ کا رہائشی مکان پرانے طرز کا بنا ہوا بہت ہی معمولی تھا۔ مکان کے باہر ایک تخت پر آپ کی نشست ہوتی تھی۔ جس پر بیّادر کا بنا ہوا ایک چھپر پڑا ہوا تھا۔

اسی مقام پر والیانِ ملک، حکّامِ سلطنت، گورنرز، وزراء، سیاسی و مذہبی رہنما، غریب و امیر سب ہی آپ کے پاس حاضری کا شرف حاصل کرتے تھے۔

دنیا کے گوشہ گوشہ سے آپ کے پاس ہزارہا خطوط آتے رہتے تھے جن میں علمی مسائل دریافت کئے جاتے تھے اور آپ خود ہی تمام خطوط کا جواب

لکھا کرتے تھے۔ غریب نادار لوگوں کی امداد بہت مخفی طور پر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ خود ان لوگوں کو بھی یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ امداد کرنے والا کون شخص ہے۔

حضرت نجم العلماء جس طرح عوام کے رہنما تھے۔ اسی طرح علماء، سماجی لیڈر اور حکام سلطنت بھی اہم ترین امور میں آپ سے مشورے حاصل کرتے تھے۔ آپ کی علمی عظمت سے متأثر ہو کر سلطنت برطانیہ نے آپ کو "شمس العلماء" کا خطاب دیا تھا۔

مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، قائد اعظم محمد علی جناح، سر آغا خان، سر سالار جنگ، عثمان علی خان نظام حیدر آباد، سر حسن امام، سر علی امام، سر رضا علی، سر وزیر حسن، جسٹس محمد رضا، نواب سر حامد علی خاں آف رامپور، سر مہاراجہ علی محمد خاں آف محمود آباد، نواب سر فتح علی خاں، سر جیمس مسٹن گورنر یو پی، علامہ اقبال، اور دوسرے اکابر و مشاہیر آپ کے انتہائی قدردان تھے۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں جب آپ نے نجف اشرف (عراق) کا سفر کیا تو کئی ہزار علماء و مجتہدین و طلابِ علم نے نجف کی آبادی سے کئی میل باہر بے پناہ احترام کے ساتھ آپ کا استقبال کیا اور اکثر علماء نے آپ سے اجازۂ اجتہاد بھی حاصل کیا نجف اشرف میں اس طرح کا استقبال اس سے قبل کسی بیرونی عالم کا نہیں ہوا تھا۔ ضعیفی کے عالم میں حضرت علامۂ ممدوح پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے۔ آپ کے کئی کمسن بچوں کی موت کے علاوہ آپ کی چار جوان شادی شدہ بیٹیاں بھی آپ کی زندگی ہی میں تہِ خاک ہو گئیں۔ آپ کے دو صاحبزادے ایک میرے والدِ ماجد حجۃُ الاسلام علامہ سید محمد مجتہد مرحوم اور دوسرے میرے عمِ محترم حجۃُ الاسلام علامہ سید محمد کاظم مجتہد مرحوم بتیس ۳۲ بتیس سال کی عمر میں آپ کے سامنے ہی انتقال کر گئے اِس طرح آپ کی زندگی ہی میں آپ کی تمام صُلبی اولاد موت کا شکار ہو گئی تھی۔ ان داغوں نے آپ کے دل و جگر کو چھلنی کر دیا

تھا لیکن اس کے باوجود حضرت علامۂ مغفور صبر کا ایک نہ جنبش کھانے والا پہاڑ ثابت ہوئے اور آپ کے عزم و ہمت میں ان جانکاہ حادثوں کی وجہ سے ذرہ برابر بھی فرق نہ آسکا اور آپ کی علمی و قومی و مُلکی مشغولیتیں بغیر کسی کمزوری کے جاری رہیں۔

آپ کے جنازے کے ساتھ گومتی ندی سے لکھنؤ شہر کے درمیانی علاقہ تک مختلف اسلامی و غیر اسلامی فرقوں کے کئی لاکھ افراد نے شرکت کی تھی۔ متحدہ ہندوستان کے تمام شہروں اور سارے اسلامی ممالک میں آپ کی صف ماتم بچھائی گئی اور آپ اپنے قائم کیئے ہوئے ناظمیہ عربی کالج میں دفن ہوئے۔

حضرت علامہ مرحوم کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ جو برّ صغیر پاک و ہند اور ممالک اسلامیہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ شمسُ العلماء علامہ سیّد سبط حسن ، علامّہ فرمان علی، علامہ محمّد ہارون، مولانا منتخب الحق صدر شعبہ اسلامیات کراچی یونیورسٹی

علامہ مفتی سید احمد علی مجتہد، علامہ مفتی سید محمدؐ علی مجتہد، علامہ سید علی نقی مجتہد صدر شعبۂ اسلامیات علی گڈھ یونیورسٹی، آپ کے شاگردوں کی اس فہرست میں داخل ہیں جس کا شمار آسانی کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔

سرکار جدّ مرحوم کے بعض خطوط اور کچھ دوسری یادگار چیزیں میری اس تحریر اور ممدوح کی تصویر کے ساتھ نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہیں۔

رضائے الٰہی کے تقاضے

ایک سچے مسلمان کیلئے اسکی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اعمال سے اپنے اللہ کو راضی رکھے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جو اُسکی ناراضی کا سبب ہو۔ یہ بات ہر صاحبِ فکر پر ظاہر ہے کہ جب اللہ ہمارا خالق ہے تو پھر یقیناً وہ ہم سے کچھ باتیں چاہتا ہے اور کچھ نہیں چاہتا اور چونکہ وہی اس بات کو بھی سب سے زیادہ جانتا ہے کہ کونسا عمل ہمارے لئے مفید ہے اور کونسی بات مضر ہے اس لئے درحقیقت صرف اُسی کی رضامندی میں ہماری فلاح و نجات ممکن ہو سکتی ہے۔ اور اُسکی ناراضی میں ہماری بربادی اور ہلاکت ہے۔ اس اصول کا صاف نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہماری پوری زندگی اور ہمارے تمام اعمال و افکار اللہ کی مرضی کے مطابق ہوں جن میں اس کی نافرمانی کا معمولی سا شائبہ بھی موجود نہ ہو۔

اللہ کی ناراضی اور رضامندی سے مقصود یہی ہوتا ہے کہ کچھ باتیں اسکے حکم اور مرضی کے مطابق ہیں اور کچھ اسکے خلاف ہیں

اور یقیناً جو باتیں اُس کے حکم کے خلاف ہونگی وہ ہمارے لیئے نقصان کا اور ضرر دنیوی و اُخروی کا باعث ہوں گی اور ہماری پیدائش کے تقاضوں کے بھی منافی ہوں گی اور جو اُس کے احکام کے مطابق ہوں گی وہ ہمارے لیئے ہر طرح مناسب و مفید اور ہماری پیدائش کے تقاضوں کے بھی عین مطابق ہوں گی اس کی رضا کا حصول، بندگی اور ایمان کی بلندی کا سبب ہے اور موجب اجر و ثواب ہے جبکہ اُس کی ناراضی اور ناخوشی اُس کے عذاب و عقاب کا باعث ہوتی ہے۔ یہاں پر ہمیں اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ رضا اور عدم رضا کا وہ مفہوم جو ہم اپنے لیئے سمجھتے ہیں اللہ کے لیئے ممکن نہیں ہو سکتا کیونکہ ہماری خوشنودی اور رضا یا ناراضی اور بیزاری کچھ کیفیات کا نام ہے جو حالات اور تأثرات کے لحاظ سے ہمارے نفس میں پیدا ہوا کرتی ہیں اور ظاہر ہے کہ اللہ کی ذاتِ اقدس کیفیات سے پاک اور منزّہ ہے۔ غرض اللہ کی خوشنودی یعنی اُس کے حکم پر عمل کرنا ہی سچے ایمان کی علامت ہے اور اس کی ناراضی ہر مرتبہ اور ہر درجہ کے لحاظ سے اسی کے مطابق کفر کے مفہوم میں داخل ہے۔ بلاشبہ ایک سچے مؤمن اور پکے مسلمان کا فرض ہے

کہ وہ ہر لمحہ میں رضائے الٰہی کی جستجو کرے اور وہی کام انجام دے جس میں اس کے پروردگار کی رضا ہو، چاہے اسکی ذات کے علاوہ اسکی مخلوق میں سے کوئی اس سے خوش رہے یا خوش نہ رہے۔ ایمان کے اس حقیقی معیار پر وہ لوگ کبھی نہیں اتر سکتے جو اللہ کی رضاجوئی کو چھوڑ کر مخلوق کی رضا اور اس کی خوشنودی کو نظر انداز کر کے بندوں کی خوشنودی اختیار کرتے ہیں۔ (قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔ (توبہ/۶۲) وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ "یعنی اللہ اور رسول اس بات کا سب سے ہی زیادہ حق رکھتے ہیں کہ لوگ انھیں راضی رکھیں اگر وہ سچے مومن ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ جو کوئی بھی اللہ اور رسول کی مخالفت کرے گا تو اُسکے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہیگا اور یہ بڑی ہی رسوائی ہے[۶۳]"۔ سورۂ بقرہ میں اللہ نے فرمایا ہے (بقرہ/۲۰۷) ترجمہ یہ ہے کہ لوگوں میں سے خدا کے بندے کچھ ایسے بھی ہیں جو اسکی رضا حاصل کرنے کی غرض سے اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں"۔ ان دونوں آیات کا مطلب بالکل صاف ہے کہ مومن کے لیے سب سے مقدم اور سب سے اہم بات یہی ہے کہ اللہ کو اپنے آپ سے راضی رکھے

اور اسکی رضامندی کا تقاضا یہ ہے کہ اُسکا بندہ اسکی راہ میں اپنے نفس کو بیچ ڈالے، یعنی بندہ وہی چاہے اور وہی کرے جو اللہ کی مرضی ہو اور کسی کام میں بھی اُس کے راستہ سے منحرف اور اسکی معصیت اور نافرمانی کا مرتکب نہ ہو۔ اب سورۂ مائدہ کی ایک آیت کا ترجمہ سُنئے جس میں فرمایا گیا ہے: بیشک اللہ کی طرف سے ایک نور یعنی رسالتِ محمدیؐ اور ایک روشن کتاب یعنی قرآنِ حکیم کا نزول ہو چکا ہے جس کے ذریعہ سے اللہ اُن لوگوں کو سلامتی اور نجات کی راہیں دکھاتا ہے جو اُسکی رضا کی پیروی کرتے رہتے ہیں اور انھیں اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نور کی طرف نکال کر لاتا ہے اور سیدھی راہ کی طرف ہدایت فرماتا ہے" (مائدہ/۵/۱۵) اس کا مطلب اسکے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ رضائے الٰہی کا حصول کسی کے لیئے بھی ممکن نہیں ہو سکتا جب تک وہ سُنتِ محمدیؐ کے نور سے روشنی نہ لے اور کتاب الٰہی سے ہدایت نہ حاصل کرے یعنی اپنی زندگی کو اس نظامِ حیات کے مطابق نہ بنالے جسے قرآن و سُنّت نبویؐ نے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اس طرح رضائے خداوندی کا مطالبہ اور تقاضا ہے کہ انسان اپنے کردار کی اصلاح کرے اور اپنے وسائلِ معیشت

کی تطہیر کرے یعنی اپنی معیشت اور اپنی دولت کو ایسے وسائل سے حاصل کرے جو اللہ اور رسولؐ نے جائز کیے ہوں اور اس کا صرف بھی اُن ہی طریقوں اور اُن ہی چیزوں میں ہو جو قرآن وسنّت کے اصول پر صحیح ہوں۔ اسی صورت سے اُس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دوسرے شعبے بھی اسلامی عدل کے معیار پر پورے اُتر سکیں اور زندگی کے یہ دونوں اہم رخ ناانصافی، بے اعتدالی اور ظلم وفساد اور تخریب سے پاک صاف ہوں۔ مُصلحِ عالم سرورِ کائنات کا ارشاد ہے:-

لَا تُسْخِطُوا اللّٰہَ بِرِضَا اَحَدٍ مِّنْ خَلْقِہٖ وَلَا تَتَقَرَّبُوْا اِلٰی اَحَدٍ مِّنَ الْخَلْقِ بِتَبَاعُدٍ مِّنَ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ اَحَدٍ مِّنَ الْخَلْقِ شَیْءٌ یُّعْطِیْہِ بِہٖ خَیْرًا اَوْ یَصْرِفُ بِہٖ عَنْہُ سُوْءًا اِلَّا بِطَاعَتِہٖ وَابْتِغَاءِ مَرْضَاتِہٖ" مطلب یہ ہوا کہ اللہ کو ناراض کر کے اس کی مخلوق میں سے کسی کی بھی خوشنودی حاصل نہ کرو اور اللہ سے دور ہو کر اس کی مخلوق میں سے کسی کا بھی تقرّب نہ تلاش کرو کیونکہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جس کے سبب سے وہ انھیں بھلائی اور نیکی عطا فرمائے اور اُن سے برائیوں کو دفع کرے سوائے اس کے کہ بندے اس کی اطاعت کریں اور اُس کی رضا حاصل کریں۔ امیر المومنین حضرت علیؑ

فرماتے ہیں: "لَا دِیْنَ لِمَنْ دَانَ لِطَاعَۃِ الْمَخْلُوْقِ فِیْ مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ"
یعنی جو شخص مخلوق کی اطاعت، رضا جوئی اور خوشنودی کی تحصیل
میں اللہ جلّ شانہ کی معصیت اور گناہ کا ارتکاب کرے، اُسکا
کا کوئی دین نہیں ہے۔ ان تمام آیات واحادیث سے پوری طرح
اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ رضائے الٰہی کا تقاضا
کیا ہے اور وہ کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ انسان جب پیدا
ہوتا ہے اور پھر بڑا ہو کر اس قابل بن جاتا ہے کہ اس سے شرعی
اور قانونی ذمّہ داریوں کا تعلق ہو تو اس کی زندگی تین شعبوں
میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک انفرادی یعنی وہ زندگی جس کا
محض اس کی اپنی ذات اور اپنے وجود سے تعلق ہوتا ہے۔
دوسرے اجتماعی یعنی وہ زندگی جس کا تعلق گھر والوں اور
خاندان والوں یا پھر پورے معاشرہ سے ہوتا ہے اور تیسری
قسم وہ ہے جس کا تعلق اس کے اللہ سے ہوا کرتا ہے۔ زندگی
کے یہ تینوں رخ بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر ان میں سے
وہ قسم جس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہے دیگر شعبوں پر حاوی
اور سب سے زیادہ اہم ہے اور اسی کامیابی پر انسان کی دائمی
فلاح و بہبود کا انحصار ہوتا ہے اور اسی بناء پر سرورِ کائنات نے

فرمایا ہے: "کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ" یعنی تم میں سے ہر ایک اپنے اپنے درجہ میں اپنی اپنی حیثیت سے حاکم ہوا کرتا ہے مگر ساتھ ہی تم میں سے ہر ایک اپنی اپنی نوعیت سے متعلق اللہ کے سامنے مسئول اور جوابدہ ہوگا۔ چاہے وہ رعیت اُس کے اپنے بدن کے اعضاء ہوں، اس کے گھر والے اور خاندان والے ہوں یا اس کے ماتحت لوگ ہوں، یا اُس کے ملازم ہوں یا اس کے کسی طرح سے بھی محکوم کہے جاتے ہوں۔ غرض انسان کی انفرادی اور اجتماعی و معاشرتی زندگی کے تمام شعبے ہمیشہ اسی مسئولیت کے تحت رہیں گے اور ہمیشہ وہ اللہ کے سامنے اِن کے متعلق جوابدہ رہے گا۔ بیشک رضائے الٰہی کا سب سے بڑا اور بنیادی تقاضا اور مطالبہ صرف یہ ہے کہ انسان اللہ کی بارگاہ کے سامنے اسی مسئولیت کے معیار پر پورا اُترے اور اِس کڑی آزمائش میں کامیاب ہو۔

روزے کی تاریخ

جہاں تک روزہ کا تعلق فاقہ یا ترک لذات سے ہے، مختلف شکلوں میں اس قسم کا روحانی فاقہ دنیا کی تقریباً ہر قوم میں موجود ملتا ہے جس کی طرف انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کی دسویں جلد میں ان لفظوں کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔

"روزہ کے اصول اور طریقے اگرچہ آب و ہوا اور ماحول کے حالات اور تاثرات کے اختلاف کی وجہ سے بہت کچھ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن مشکل ہی سے کسی ایسے مذہب کو پیش کیا جاسکتا ہے جس کے روحانی نظام اور مذہبی اصول میں روزہ کو کلیّۃً طور پر نہ مانا گیا ہو" ہندوؤں میں جو برت رکھنے کا رواج ہے وہ بھی اسی قسم کا ایک روحانی فاقہ ہے۔ ہندو قوم کی جتنی شاخیں اور جس قدر مذاہب ہیں اُن سب ہی میں

برکت کا طرح طرح سے رواج پایا جاتا ہے۔ یونانیوں اور پارسیوں میں بھی اس قسم کے فاقے رائج تھے۔ غرض اس طرح وہ تمام قومیں جن کا حضرت آدمؑ سے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کی آسمانی شریعتوں اور کتابوں میں سے کسی سے بھی تعلق نہ تھا، اُن میں بھی اس مذہبی اور روحانی فاقہ کا وجود ملتا ہے اور وہ غیر مسلم لوگ بھی اس قسم کے فاقہ کی مذہبی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ اسباب اس رواج کے مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سمجھدار لوگوں نے اس قسم کے فاقوں اور محدود طریقہ پر ترک لذات کے فائدوں کو محسوس کیا ہو اور اس کے بعد ہی اسے رواج دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہر دور کے انبیاءؑ نے چونکہ اللہ کے حکم سے روزہ اپنی اپنی امتوں پر لازم کر دیا تھا اُسے دیکھ کر غیر قوموں نے بھی پیغمبروںؑ کے روحانی نظام کے اس جزو یعنی روزہ کو اپنے بنائے ہوئے نظام میں داخل کر لیا ہو اور اس کی شکل و صورت بدل دی ہو۔

رہا روزہ کا وہ تعلق جو انبیاءؑ اور مرسلین کی شریعتوں اور ہدایات سے ہے اُسکی شکل و صورت اور احکام و حدود

کی تاریخ کی طرف قرآنِ حکیم کی یہ آیت صاف طریقہ پر اشارہ کر رہی ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ ۱۸۳) مسلمانو! تم پر روزہ اسی طرح واجب کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے کی امتوں پر واجب کیا گیا تھا۔

اس کا مطلب صاف ہے کہ جب اس کرۂ زمین پر نوعِ انسان کے لیئے اللہ نے شرعی نظام نافذ کیا اور نبوّتوں کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السّلام کو بھیجکر شروع کیا گیا اسی وقت سے روزہ کا حکم بھی دیا گیا ہے اور ہر نبیؑ کے دور میں اس کا وجود تھا۔ اسی بنا پر موجودہ مسخ شدہ توراۃ و انجیل میں بھی جابجا روزہ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ توراۃ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کوہِ طور پر چالیس دن بھوک اور پیاس کے ساتھ گذارے اسی بنا پر یہودیوں میں چالیس دن روزہ رکھنے کا رواج ہے۔

انجیل متّی میں حضرت عیسٰیؑ کے روزہ کا ذکر پایا جاتا ہے کہ انہوں نے جنگل میں چالیس دن تک روزہ رکھا آپ اپنی قوم کو روزہ رکھنے کی ہدایت فرماتے تھے اور اُن سے کہا کرتے تھے کہ جب تم روزہ رکھو تو دکھاوا کرنے والوں

کی طرح اپنا چہرہ اداس نہ بنایا کرو کیونکہ وہ اپنا مُنہ اس لیے بگاڑتے ہیں کہ لوگ انھیں روزہ دار سمجھنے لگیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ لوگ اپنا بدلا پا چکے لیکن جب تم روزہ رکھو تو اپنے سر میں تیل لگاؤ اور مُنہ دھوؤ تاکہ دوسرے لوگوں کے سامنے نہیں بلکہ اپنے باپ کے سامنے جو لگاہوں سے پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو اور تمہارا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تم کو ظاہر میں اس کا بدلا عطا کرے۔" انجیل متیؑ میں ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ سے ان کے شاگردوں نے دریافت کیا کہ ہم خراب اور پلید روحوں کو اپنے نفس سے کس طرح نکال سکتے ہیں تو آپ نے جواب میں فرمایا "خراب روحیں سوائے دعا اور روزہ کے کسی دوسری چیز سے نہیں نکل سکتیں"

خود عرب کے لوگ بھی جاہلیت کے زمانہ میں عاشورا کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ اس طرح جب سے انسان زمین میں آباد ہوا روزہ کی ابتدا بھی اس کے ساتھ ہی ساتھ ہوئی۔ اور ہر قوم اور ہر مذہب میں اس کا رواج رہا اور اس کو نفس کی صفائی اور تطہیر کے لیئے ایک مؤثر ذریعہ سمجھا جاتا رہا

مگر حقیقت یہی ہے کہ اس کی ابتدائی تعلیم پیغمبروں کو وحیِ الٰہی سے دی گئی جس کا سلسلہ نوعِ انسان کے باپ حضرت آدمؑ سے شروع ہوا اور پھر اب شریعتِ مصطفوی میں شامل ہوکر یہ سلسلہ قیامت تک رہے گا۔ اسلام میں روزہ کی بہت سی قسمیں ہیں کچھ فرض ہیں کچھ نفل ہیں۔ ماہِ رمضان المبارک کے روزے ہر بالغ و عاقل مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہیں جنکے تفصیلی احکام دینی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں لیکن بہرحال اسلام میں روزہ کا مطلب صرف فاقہ نہیں اور صرف کھانے اور پینے کو ترک کردینا نہیں ہے بلکہ اس کی شرطیں اور احکام مقرر ہیں جن کو پورا کیے بغیر روزہ صحیح نہیں ہوتا۔

فضائل رمضان المبارک

یوں تو ہر ساعت، ہر دن اور ہر مہینہ اللہ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے مگر جس مہینہ کو اس نے اس قدر فضیلت عطا فرمائی ہے کہ وہ اس کی ذات کی طرف منسوب ہو کر "شہرُ اللہ" کہا جاتا ہے وہ یہی رمضان المبارک کا مہینہ ہے اور جس کی ہر آن اور ہر لمحہ برکتوں اور رحمتوں کا ایک عظیم خزانہ اور نہ ختم ہونے والا سرچشمہ ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے ایک مشہور خطبہ میں فرمایا تھا: "نَوْمُکُمْ فِیْہِ عِبَادَۃٌ وَ اَنْفَاسُکُمْ فِیْہِ تَسْبِیْحٌ"

مقصود یہ تھا کہ اس مبارک مہینہ میں روزہ دار اہلِ ایمان کی نیند بھی عبادت میں شمار کی جاتی ہے اور ان کی سانس کے سلسلہ کو بھی تسبیح قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پھر ان کے رکوع و سجود اور دوسری عبادتوں کا کیا مرتبہ ہوگا۔ اسی خطبہ میں حضورؐ نے فرمایا تھا: ——

شَہْرٌ هُوَ عِنْدَ اللّٰہِ اَفْضَلُ الشُّہُوْرِ وَ اَیَّامُہٗ اَفْضَلُ الْاَیَّامِ وَلَیَالِیْہِ اَفْضَلُ اللَّیَالِیْ وَسَاعَاتُہٗ اَفْضَلُ السَّاعَاتِ هُوَ شَہْرٌ دُعِیْتُمْ فِیْہِ اِلٰی ضِیَافَۃِ اللّٰہِ"

یہ وہ مبارک مہینہ ہے جو اللہ کے نزدیک تمام مہینوں سے افضل ہے، اس کے تمام دن تمام دنوں سے اس کی تمام راتیں تمام دوسری راتوں سے اور اس کی تمام ساعتیں تمام ساعتوں سے افضل و بہتر ہیں۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں تم اللہ کے مہمان ہوتے ہو۔

پھر آپ نے فرمایا کہ تم اس ماہ مبارک میں خالص اور سچی نیت اور صدق دل سے خدا کی بارگاہ میں دعا کیا کرو کہ وہ تمہیں اس میں روزہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور قرآنِ حکیم کی تلاوت کا شرف مرحمت کرے۔

وہ شخص بڑا بدنصیب ہے جو اس مبارک مہینہ میں خدا کی مغفرت اور بخشش سے محروم رہ جائے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ تم اپنی بھوک اور پیاس سے روزِ قیامت کی بھوک اور پیاس کو یاد کرو۔ اپنے غریبوں اور محتاجوں کی خدمت اور مدد کرو، اپنے بزرگوں کی توقیر اور تعظیم کیا کرو اور چھوٹوں پر رحم و کرم کرتے رہو

اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحم کا برتاؤ کرو، اپنی زبانوں اور آنکھوں کو ان باتوں سے محفوظ رکھو جو ان کے لیے جائز نہیں ہیں، یتیموں پر رحم کرو اور ان کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ اور خدا کی بارگاہ میں اپنے گناہوں سے توبہ کرتے رہو۔ پھر حضورؐ نے فرمایا کہ تم میں سے اگر کوئی مؤمن کسی دوسرے روزے دار مؤمن کا روزہ افطار کرائے تو اُسے ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے اور اُس کے گناہ بھی بخش دیئے جاتے ہیں اگرچہ وہ کھجور کے ایک ٹکڑے یا پانی کے ایک گھونٹ ہی سے کیوں نہ افطار کرائے۔

خطبہ کے آخر میں آنحضرتؐ نے ارشاد کیا تھا کہ یہ وہ مبارک مہینہ ہے جس میں جنتوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور شیطانی گمراہ کن طاقتوں کو مقید کر دیا جاتا ہے۔ بظاہر حضورؐ کا مقصود یہ تھا کہ جب اہلِ ایمان خلوصِ دل اور خضوع و خشوع کے ساتھ روزے رکھیں گے اور عبادت کریں گے تو نفس میں صلاحیتِ خیر بڑھے گی اور بدی کا جذبہ فنا ہو جائے گا۔ اور پھر ظاہر ہے کہ اللہ اپنے فرماں بردار بندوں سے خوش ہوگا اور انھیں بے حساب ثواب عطا فرمائیگا اور دوسری طرف شیطانی طاقتوں کے لیئے ضلالت و گمراہی

پھیلانے کی تمام راہیں بند ہو جائیں گی۔ مگر یہ سب کچھ اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان احکام خداوندی پر پورے یقین اور خلوص کے ساتھ عمل کرے اور خدا و رسولؐ کی معرفتِ کامل رکھتا ہو اور اسے اچھی طرح سمجھتا ہو کہ اللہ اس کے ہر عمل اور اس کی ہر نیت سے باخبر ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اس ماہ مبارک کی جلالت و عظمت کے پیش نظر جس طرح اس میں ہر عملِ خیر کا ثواب بے حد ہے اسی طرح اس ماہ میں بُرے اعمال کی سزا بھی بڑی سخت ہو گی اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس ماہِ مبارک کی عظیم برکتوں سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور سعی کرے اور اپنے نفس اور کردار کی تطہیر کے اس بہترین موقع سے محروم نہ رہ جائے۔

اقامتِ صلوٰۃ سے مراد

"صلوٰۃ" یعنی نماز اللہ کی اطاعت و بندگی کے ایک خصوصی مظاہرہ کا نام ہے جس کا طریقہ اس نے خود ہی مقرر فرمایا ہے اور اپنے بندوں کو اپنے رسولؐ کے ذریعہ سے اُس کی تعلیم دی ہے اور اس کی تفصیلات سے آگاہ کیا ہے۔

قرآن حکیم نے "اِقامَتِ صلوٰۃ" جس کا مفہوم یہ ہے کہ نماز کو اس کے تمام شرائط و آداب کے ساتھ اور بھرپور پابندی کے ساتھ ادا کرتے رہنا" — کے متعلق جو خصوصی اہمیت کا انداز اختیار کیا ہے وہ اسی سے ظاہر ہے کہ نماز کا ذکر اور اسے ادا کرنے کا حکم قرآن میں ایک سَو سے زیادہ مقامات پر موجود ہے۔ اُن تمام مقامات کا ذکر چند منٹ کے مختصر وقفہ میں کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے میں

چند آیاتِ کریمہ اور ان کے ذریعہ سے جو ہدایات فرمائی گئی ہیں انھیں آپکے سامنے پیش کرتا ہوں۔ پھر کچھ حدیثوں کا ذکر کروں گا اور اسی سلسلہ میں نماز کی سماجی، انفرادی، اجتماعی و روحانی اور اخلاقی اور اس کے دیگر پہلوؤں کی افادیت اور اہمیت پر تبصرہ بھی ہو جائے گا۔

آیئے سب سے پہلے ہم اس بات کو دیکھیں کہ ہم بحیثیت ایک سچے مسلمان کے جس کتاب پر بحیثیت اللہ کی آخری کتاب کے ایمان رکھتے ھیں اور جس کے ایک لفظ اور ایک حرف کا بھی انکار نہیں کر سکتے اور اس کا یقین کامل رکھتے ہیں کہ اِس کتابِ مقدس کا ایک ایک حرف اللہ کا نازل کیا ہوا ہے۔ نہ اس کتاب سے بہتر کوئی کتاب ہے اور نہ اُس نظام سے بہتر کوئی نظامِ زندگی ممکن ہے جو قرآنِ حکیم نے پیش کیا ہے۔

اس سلسلہ میں پورے کرۂ زمین کے تمام مسلمان ایک آواز میں صرف یہی کہیں گے: بیشک! بیشک! قرآنِ پاک اللہ کی برحق کتاب ہے۔ اس کی ہر بات حق،

اس کا ہر حکم حق اور اس کی ہر ہدایت و نصیحت حق ہی حق ہے۔ باطل، گمراہی اور غلطی کا تو اس میں تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اس پوری حقیقت کے سامنے آجانے کے بعد پھر خود بخود ذہن میں یہ سوال ابھرنے لگتا ہے کہ کیا یہ بات ممکن ہے کہ مسلمان اپنے اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے نماز کی طرف سے جان بوجھ کر لاپروائی کر سکتا ہے؟ اور اگر وہ عملاً، ارادۃً اور جان بوجھ کر نماز نہیں پڑھتا، اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، نماز کا وقت گذرتا رہتا ہے اور وہ دوسرے کاموں میں بالارادہ مشغول رہتا ہے، نہ خود نماز پڑھتا ہے اور نہ اپنے ماتحت ملازموں، اپنے شاگردوں اور اپنی اولاد کو نماز پڑھنے کی تاکید کرتا ہے، غرض تغافل اور لاپروائی کی جس قدر بھی صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں وہ سب موجود ہیں تو کیا وہ صحیح اور حقیقی معنی میں مسلمان ہے؟ قرآن پاک پر اس کا ایمان ہے اور وہ خدا و رسولؐ کا مطیع اور فرماں بردار ہے؟ اسی بات کا فیصلہ دوسروں سے پہلے ایسے شخص کو خود ہی کر لینا چاہیئے

اور یقینی طور پر اپنے کردار کے متعلق خود احتسابی ہی کے ذریعہ سے بہتر فیصلہ ہو بھی سکتا ہے۔

جہاں تک قرآنی ارشادات کی بات کا تعلق ہے تو قرآن پاک کو کھولتے ہی جب سب سے پہلی سورت یعنی سورۂ حمد پر ہماری نظر پڑتی ہے تو ہمیں یہ آیت نظر آتی ہے۔ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سورۂ حمد کی تلاوت ہر نماز میں ضروری ہے، تو لازمی طور پر ہر مُصَلّی یعنی نماز پڑھنے والا اس آیت کی بھی تلاوت کرتا ہے۔ اس کے معنی ھیں: ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تیری ہی ذات سے مدد مانگتے ہیں" پھر ظاہر ہے کہ "عبادت" زبان یا دوسرے اعضاء وجوارح کی صرف حرکت وسکون کا نام نہیں ہے بلکہ اس عمل کے ساتھ نیت اور ارادہ بھی لازمی ہے جس کے بغیر کسی عمل کی کوئی بھی حیثیت اور وقعت نہیں ہوتی اور اسی نیت اور اخلاص کی نوعیت کے مطابق اعمال کے درجے بھی مقرر کئے جاتے ہیں۔

اس طرح نماز پڑھنے والا پورے خلوص اور پوری لگن کے ساتھ اپنی زبان سے بار بار اپنے اللہ کے سامنے اس کا اقرار کرتا ہے کہ میں تیری اطاعت و عبادت اور فرماں برداری میں اور تجھ سے استعانت میں کسی کو بھی شریک نہیں کر سکتا اور میری پوری زندگی اور تمام اعمال صرف تیری ہی خوشنودی کے لئے ہیں اور کوئی بات بھی میں تیرے حکم کے خلاف کبھی نہیں کروں گا۔

غرض میں تو صرف تیرا ہی فرماں بردار ہوں اور یا پھر اس کی فرمانبرداری کروں گا جس کی فرماں برداری کا تو نے حکم خود ہی دیدیا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اُس شخص یعنی نبیؐ و رسول کی فرماں برداری درحقیقت تیری ہی فرمانبرداری ہو گی۔

ان دو بنیادی باتوں کا یعنی "نبیؐ اور رسول کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے" اور "مسلمان کی پوری زندگی اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کا مظہر ہے" قرآن پاک میں بڑی وضاحت کے ساتھ اعلان کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے

دیکھیے سورۃ الانعام آیت (۱۶۲، ۱۶۳) قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ٥ اے رسول کہہ دو! کہ میری نماز اور میری تمام عبادتیں اور میری زندگی اور میری موت صرف اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے"۔

اس طرح ہر نماز پڑھنے والا کُھلے لفظوں میں ہر نماز میں اسی بات کا دن اور رات مسلسل اقرار کرتا رہتا ہے، ان الفاظ کے ساتھ کہ: "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" تو اور صرف تو ہی میرا تنہا معبود ہے اور نہ صرف میرا بلکہ تمام جہانوں کا وحدہٗ لاشریک معبود ہے۔ نہ تیرے علاوہ کوئی معبود ہو سکتا ہے اور نہ تیرے سوا کوئی ربّ اور پروردگار ہو سکتا ہے۔

رہی دوسری بات کہ نبی و رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ اس کے لئے قرآن پاک میں سورۂ نساء کی آیت نمبر ۸۰ کا مطالعہ کیجیے اللہ فرماتا ہے: "مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ"

"جس نے رسُول کی اطاعت کی تو حقیقتاً اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی" کیونکہ یہ اطاعت و فرمانبرداری اُسی کے حکم سے ہے۔ اس ارشادِ خداوندی سے ایک قطعی اور لازمی نتیجہ اور بھی سامنے آجاتا ہے وہ یہ کہ پھر جس نے رسولؐ کی نافرمانی کی اس نے حقیقت میں اللہ کی معصیت اور نافرمانی کا ارتکاب کیا۔ یہ قرآنی اعلان بالکل عام اور غیر مشروط طریقہ پر ہے جس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اللہ کا رسُول جس بات کا بھی حکم دے گا خواہ وہ اخروی باتوں سے متعلق ہو یا دینوی امور سے متعلق ہو اُس پر عمل کرنا امت کے لئے ضروری ہے کیونکہ وہ درحقیقت اللہ کا حکم ہے جس سے سرتابی کا تصور تک کوئی مسلمان نہیں کرسکتا۔ اگر اس "عموم اور اطلاق" میں ذرا سی بھی گنجائش قید اور شرط لگانے کی ہوسکتی تو جس طرح والدین کی اطاعت کے حکم میں اس کی قید لگا دی گئی ہے کہ اگر وہ حق کی بات کہیں، اگر وہ گمراہی کی طرف نہ لے جائیں، اگر وہ شرک کی دعوت نہ دیں تو ان کی اطاعت کرنا ورنہ ہرگز نہ کرنا تو پھر اگر

"اطاعتِ رسولؐ" میں بھی اس قسم کی کوئی گنجائش ہوتی تو یہاں پر بھی کچھ اس قسم کی احتیاطی قیدیں اور شرطیں لگادی جاتیں مگر یہاں کوئی قید اور شرط موجود نہیں ہے، اعلان اور حکم اطاعت رسولؐ بالکل مطلق اور غیر مشروط ہے اور اس حقیقت کا مظہر ہے کہ یہ اطاعت خود اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ اس طرح ہمارے سامنے بالکل واضح اور صاف طریقہ پر یہ بات آجاتی ہے کہ نبی و رسول تمام اُن لوگوں سے افضل ہوتا ہے جن کی طرف اُسے اللہ بھیجتا ہے اور اس کا ہر فعل، ہر قول اور ہر حکم اور ہر رائے، منشاء خداوندی کے مطابق ہوتی ہے جس میں کبھی کوئی غلطی اور خطا نہیں ہو سکتی اور نہ اُس سے افضل اور بہتر کسی دوسرے کی رائے ہو سکتی ہے کیونکہ اُس کی رائے اور اس کا حکم اللہ ہی کا منشاء اور دراصل اسی کا حکم ہوتا ہے اس لئے نبی اور رسول کا معصوم عن الخطا ہونا ضروری ہے ورنہ بعثتِ رسول کا اصلی مقصد ہی باقی نہیں رہ سکتا۔

غرض "اس غیر مشروط اور مطلق اطاعتِ خداوندی" کے اقرار اور عہد کا بہترین مظاہرہ "صلوٰۃ" یعنی نماز ہے جس میں قیام، قعود، رکوع، سجدہ، زبان اور دوسرے تمام اعضاء

وجوارح کی حرکت و سکون اور ذہن و فکر، تصور و خیال
کے تمام رخوں کو سمیٹ دیا گیا ہے تاکہ نمازی اپنے پورے
وجود اور اپنی ہستی کی پوری وسعت پر بندگی کے جذبہ
کو محیط کرکے پورے یقین کے ساتھ یہ سمجھے کہ وہ گویا
اللہ کے سامنے حاضر ہے اور اسی استغراق اور محویت
اور کامل سپردگی کا یہ بے مثال والہانہ انداز اور بہترین مظاہرہ
"نماز" کہلاتا ہے۔ اس میں ایک سچا نمازی یہ کامل تصور
رکھتا ہے کہ وہ گویا اللہ کے سامنے کھڑا ہے اور اُس سے
براہِ راست خطاب اور اظہار عاجزی اور اقرار و عہد فرمانبرداری
کر رہا ہے۔ اسی قسم کی نماز کو ادا کرنے اور اس پر
پابندی رکھنے کی کوشش کرنے کا حکم ہر مسلمان کو دیا گیا ہے
اور اسی طرح کی نماز کا ردِّ عمل مسلمان کی پوری زندگی
کو اسلام اور قرآن کے مطابق ایک معیاری اور مثالی اسلامی
زندگی میں ڈھال سکتا ہے اور پھر نتیجہ میں مسلمان ہر قسم کی
برائیوں اور بدکرداری سے پوری طرح محفوظ رہ سکتا ہے
اُس کی پوری زندگی نیکیوں کے ایسے مستحکم حصار میں
محفوظ ہو جاتی ہے جہاں بدی اور شر و فساد کا گذر بھی نہیں ہو سکتا۔

ایسی ہی نماز کے لئے سورۂ عنکبوت میں فرمایا گیا ہے (آیہ/۴۵)
"وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ" نماز کو قائم کرو یعنی پابندی اور پورے شرائط کے ساتھ اُسے ادا کرتے رہو۔ یقیناً ایسی نماز ہر قسم کی برائیوں سے انسان کو محفوظ بنا دیتی ہے" سرورِ کائنات نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا تھا: اے ابوذرؓ! تم نماز اس طرح پڑھا کرو گویا تم اللہ کو اپنے سامنے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ آپکا مقصود یہ تھا کہ وہ رعب اور خوف جو ایسی عظیم ترین ذات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد کسی پر طاری ہو سکتا ہے وہ تم پر طاری ہو جانا چاہیئے۔ پھر فرمایا: اور اگر تم اُسے خود نہیں دیکھ سکتے تو اس کا تمہیں ہر حال میں یقین رکھنا چاہیئے کہ تمہارا اللہ تمہیں ضرور دیکھ رہا ہے اور تم کسی حال میں بھی اس کے احتساب سے باہر نہیں ہو سکتے"۔

ایسی ہی نماز کے لئے حضورؐ انور نے فرمایا ہے "نماز دین کا ستون ہے" اسی کے لئے ارشاد ہوا ہے: نماز دل کی روشنی ہے" نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے" اسی حقیقت کو یوں بھی ظاہر فرمایا: کفر و ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی سے ہے"! وہ ہولناک وقت!

وہ تاریخ کا عظیم ترین لمحہ جب سرورِ انبیاء، خاتم المرسلین، مقصدِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ظاہری، مادی اور جسمانی زندگی کے آخری لمحے گذر رہے تھے، زمین اور آسمانوں کا ذرّہ ذرّہ کانپ رہا تھا، کائنات کی فضائیں فراقِ رسولؐ مدنیؐ کے غم میں خموش تھیں، شمعِ رسالت کے پروانوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ اُس یادگار لمحہ میں بھی سرورِ دو عالمؐ نے اپنی زبان مبارک سے جو آخری وصیّت فرمائی وہ یہی تھی ——— "نماز اور غلام" ——— یعنی نماز کو کبھی نہ چھوڑنا اور غریبوں اور غلاموں کی حق تلفی کبھی نہ کرنا۔

اسلامی کردار

اسلام نے نسلی، لسانی اور طبقاتی تفرلق اور نیچ اونچ کو جس طرح مٹایا ہے اسکی مثال کسی دوسری جگہ ہرگز نہیں ملتی۔ اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہر مسلمان کے لئے خواہ وہ کسی خاندان، کسی رنگ ونسل اور کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، کوئی زبان بولتا ہو اور کسی ملک میں رہتا ہو سب سے بڑی اور بنیادی چیز یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے اور اس کے حکم پر عمل کرے اور سچے دل سے ایمان اختیار کرے۔ غریب ہو یا امیر ہو، حاکم ہو یا محکوم ہو، غلام ہو یا آزاد ہو، نوکر ہو یا آقا ہو سب ہی کیلئے اللہ کے حکم پر عمل کرنا ضروری ہے۔ قرآن حکیم کے سورۃ الحجرات[۱۳] میں اللہ کا فرمان ہے:
اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ‘‘اللہ کے نزدیک سب لوگوں میں زیادہ عزت اسی کی ہے جو اللہ سے زیادہ ڈرتا ہو اور زیادہ پرہیزگار ہو۔ قبیلے، خاندان، اور قومیں الگ الگ تو

صرف اس لیے ہیں کہ اس نشان کے ذریعہ سے لوگ ایک دوسرے کو پہچان سکیں کہ کون کہاں کا رہنے والا ہے اور کس نسل سے تعلق رکھتا ہے اور کس ملک کا باشندہ ہے۔ مگر جہاں تک اس کی ذاتی حیثیت کا تعلق ہے اور اونچ نیچ، پستی و بلندی نیز مرتبہ کے بڑے اور چھوٹے ہونے کا تعلق ہے یہ بات اسلام کے نزدیک انسان کے صرف کردار و عمل یعنی " MERIT " پر موقوف ہے۔ جو شخص بھی اسلام، ایمان کے معیار پر زیادہ اترے گا اسی کا مرتبہ اللہ کے نزدیک زیادہ بڑا ہوگا۔ چاہے وہ دنیوی حیثیت سے کتنا ہی غریب اور کتنا ہی بے عزت سمجھا جاتا ہو۔ یہی تو وجہ تھی کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب پہلی مرتبہ اسلام کی آواز مکہ کی سرزمین پر بلند کی تھی تو ابتدا میں غریبوں اور غلاموں اور بے سہارا لوگوں ہی نے اس آواز پر لبیک کہی تھی اور سب سے پیشتر آپ کے گرد غریب دنیا دار طبقہ ہی جمع ہوا تھا کیونکہ یہ سب انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم تھے اور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان حقوق کی حفاظت کے علمبردار تھے اور آپ نے اس کا اعلان عام

کر دیا تھا کہ اسلام کسی جاندار کو اسکے بنیادی حقوق سے محروم نہیں ہونے دیگا۔ اور نوع بشر کا کوئی فرد ایسا باقی نہ رہیگا جسے اُس کے بنیادی حقوقِ زندگی نہ مل جائیں۔

اسی بنا پر حضور اکرمؐ نے اس بات کا کھلے ہوئے لفظوں میں اعلان فرما دیا تھا کہ "اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَذْھَبَ عَنْکُمْ بِالْاِسْلَامِ نَخْوَۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ وَتَفَاخُرَھَا بِآبَائِھَا" اللہ نے اسلام کے ذریعہ سے زمانۂ جاہلیت کا غلط اور جاہلانہ دستور کہ لوگ اپنے باپ دادا پر فخر کرتے تھے اور نسل و قوم پر اکڑتے تھے یہ سب کچھ مٹا دیا ہے۔ تم سب کو یہ بات کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ تم سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور وہ مٹی سے پیدا ہوئے تھے اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا صرف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار اور سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو۔

بلاشبہ مسلمانوں میں کسی قسم کی بھی طبقاتی تفریق نہیں ہے۔ اسلام نے جس بات کو فضیلت کا معیار قرار دیا ہے وہ صرف "MERIT" اور صرف تقویٰ اور صرف ایمان اور اسلامی کردار ہے اگر اسلامی تعلیم کا

مظاہرہ کسی کو دیکھنا ہو تو وہ حج کے میدان اور جماعت کی نمازوں کو دیکھ لے جہاں امیر و غریب، حاکم و محکوم سب ہی ایک صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ خواہ وہ کسی ملک میں رہتا ہو۔ کوئی زبان بولتا ہو۔ اور کسی حال میں ہو۔

انسانی اخوّت اور اسلام

اسلام کا لفظ "سِلْم" سے بنا ہے جس کے معنی صلح اور سلامتی کے ہیں اسلئے بنیادی اور اصولی طور پر اسلام کی تمام تعلیمات کا مقصد یہی ہے کہ انسانی معاشرہ میں امن و سلامتی پیدا ہو اور فساد و تخریب کی جڑیں پوری طرح کاٹ دی جائیں۔ اسی اصول کے پیش نظر قرآن و حدیث میں جہاں اس پر زور دیا گیا ہے کہ ہر مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کا پاس و لحاظ رکھے اور اپنے قول و عمل سے کسی وقت بھی آداب اخوت و برادری کی خلاف ورزی نہ کرے، ساتھ ہی اس بات کی بھی تعلیم دی گئی ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ عام انسانی افراد کے حقوق کا بھی لحاظ رکھیں اور اس نظریۂ عدل و انصاف پر مضبوطی سے قائم رہیں جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے اور جس میں اپنے اور پرائے اور مسلمان یا غیر مسلم کی کوئی قید نہیں لگائی گئی۔ قرآن حکیم میں اللہ کا ارشاد ہے:- وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ

اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (مائدہ۸) اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل و انصاف کو چھوڑ بیٹھو۔ تمہیں ہر صورت میں عدل کرنا چاہیئے کیونکہ یہ بات پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔ سورہ مائدہ کی اس آیت میں کھلے ہوئے لفظوں میں مسلمانوں کو اس کا حکم ہوا ہے کہ وہ پورے انسانی معاشرہ کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لیں اور کسی بھی انسانی فرد کے حقوق کو برباد کرنے کی کوشش نہ کریں اور اس سے وہی برتاؤ کریں جو انسانی برادری اور اخوت کا تقاضا ہو۔

اسی طرح سورہ مائدہ کی ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے

مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ "یعنی جو شخص کسی کو نہ تو جان کے بدلے میں اور نہ ملک میں فساد پھیلانے کی سزا میں (یعنی ناحق) قتل کر ڈالے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور اسی طرح جس شخص نے کسی ایک آدمی کو جلا لیا تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو حیات دیدی (آیۃ/۳۲)

اس آیت میں بھی احترام انسانیت اور انسانی برادری اور اخوت

کے اسلامی نظریہ کی پوری طرح ترجمانی فرما دی گئی ہے جس سے بڑھ کر دنیا کی کوئی قوم نہ کبھی کوئی اصول پیش کر سکی ہے اور نہ آئندہ پیش کر سکے گی۔ اس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ اسلام کے نزدیک ایک انسانی جان کی قیمت بھی پورے انسانی معاشرہ کی جان کی قیمت کے برابر ہے اور اس کی کوئی قید نہیں لگائی گئی کہ وہ انسانی جان اور وہ انسانی فرد کون ہے۔ اس سے زیادہ انسان دوستی اور انسانی اخوت کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

سورۂ نحل کا یہ اعلان خداوندی بھی عام ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ بے شک اللہ انصاف کرنے کا اور حسنِ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اس ارشادِ الٰہی کا تعلق بھی ہر انسان سے ہے چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ (سورۃ النحل/۹۰)

سورۂ نساء (آیۃ/۵۸) میں بھی اسی قسم کا عام حکم ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک انسان دوستی اور احترامِ انسانیت کا معیار کس قدر وسیع ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ یعنی جب تم لوگ کسی قسم کا بھی فیصلہ کرو تو یاد رکھو کہ ہمیشہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک

ایک مشہور حدیث میں بھی اسی انسان دوستی کی طرف اشارہ موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے: مَنْ عَامَلَ النَّاسَ فَلَمْ یَظْلِمْهُمْ وَحَدَّثَهُمْ فَلَمْ یَکْذِبْهُمْ وَوَعَدَهُمْ فَلَمْ یُخْلِفْهُمْ فَهُوَ مِمَّنْ کَمُلَتْ مُرُوَّتُهٗ وَظَهَرَتْ عَدَالَتُهٗ وَوَجَبَتْ اُخُوَّتُهٗ وَحَرُمَتْ غِیْبَتُهٗ" جو شخص لوگوں سے معاملات میں ظلم نہیں کرتا اور کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور وعدہ کر کے اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا تو یقیناً اس کی بلندیٔ نفس کامل ہے، اُس کی عدالت ظاہر ہے اور اُس کی دوستی واجب اور بدگوئی حرام ہے۔ اس حدیث میں بھی اس کی وضاحت موجود ہے کہ سچا اور کامل وہی شخص ہے جو تمام بنی نوع انسان کے ساتھ انصاف سے پیش آئے، اُن کے حقوق کا پاس و لحاظ کرے اور اُن پر ظلم نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہو سکتی جب تک انسان میں دوستی کا جذبہ موجود نہ ہو۔

ایک دوسری حدیث میں حضورؐ نے فرمایا ہے: اَحَبُّ النَّاسِ اِلَی اللّٰہِ اَکْثَرُهُمْ حُبًّا اِلَی النَّاسِ" اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ انسان ہے جو دوسرے انسانوں کو سب سے زیادہ محبوب رکھتا ہو۔ ایک دوسری حدیث کا ترجمہ یہ ہے: آپس میں ایک دوسرے

سے دشمنی نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد نہ کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور اے خدا کے بندو سب مل جل کر ایک دوسرے کے بھائی بن جاؤ۔"

ایک اور حدیث کا ترجمہ یہ ہے: خدائے رحمان اُن لوگوں پر رحم فرماتا ہے جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں۔ تم ان لوگوں پر رحم کرو جو زمین میں رہتے ہیں تو آسمان والا یعنی اللہ تم پر رحم فرمائے گا۔ ایک دوسری حدیث میں حضورؐ فرماتے ہیں: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اِلَّا رَحِیْمٌ۔ "جنت میں وہی شخص داخل ہوگا جس کے دل میں دوسروں کے لئے رحم ہوگا۔"

ایک اور حدیث کے یہ لفظ ہیں: خَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ۔ "تم تمام لوگوں سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آیا کرو۔ ظاہر بات ہے کہ سچی خوش اخلاقی صرف وہ ہے جو دل سے ہو اور یہ چیز اُسی وقت ممکن ہے جب دل میں لوگوں کی محبت ہو اور اُن کی دشمنی موجود نہ ہو۔ علامہ نسائی نے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ۔ "سچا مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے انسان محفوظ رہیں۔ اس حدیث سے اس بات کی

پوری طرح وضاحت ہوجاتی ہے کہ اسلام کے نزدیک انسانی اخوت کا درجہ کس قدر بلند ہے۔

سرورِ کائنات نے ایک اور موقع پر یہ ارشاد فرمایا تھا:
"اَلْخَلْقُ کُلُّھُمْ عِیَالُ اللّٰہِ وَ اَحَبُّھُمْ اِلَی اللّٰہِ اَنْفَعُھُمْ لِعِیَالِہٖ"
یعنی اللہ کی پیدا کی ہوئی ساری مخلوق گویا اس کا کنبہ ہے اور وہ اس میں سب سے زیادہ اسی شخص سے محبت کرتا ہے جو اس کے اس کنبہ یعنی اس کی مخلوق کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ اسی کے ساتھ ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں۔ "وَاَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ" تم دوسرے انسانوں کے لئے بھی وہی نیک بات پسند کرو جو اپنے لئے چاہتے ہو۔

ان تمام قرآنی آیات اور تمام احادیث سے یہ حقیقت ہمارے سامنے کھل کر آجاتی ہے کہ اسلام انسانی معاشرہ کا کس قدر احترام کرتا ہے اور اس کا یہ بنیادی مقصد ہے کہ لوگوں کے دلوں میں آپس کی محبت اور دوستی پیدا کرے اور دشمنی بُغض، کینہ پروری، تعصب اور عداوت کو مٹا دے۔ اسلام کے اس نظریۂ محبت میں رنگ، نسل، خطّہ، ملک و قوم، زبان اور

مذہب میں سے کسی بات کی بھی کوئی تفریق موجود نہیں ہے
اگر اسلام کی اس ہدایت پر دنیا پوری طرح عمل کرے تو
آج بھی یہ انتشار اور فساد سے بھری ہوئی اور دہشت وخوف
سے سسکتی ہوئی دنیا امن وامان، صلح وسلامتی اور اخوّت و
محبت کی جنت بن سکتی ہے۔

جعفرؓ بن ابی طالب اور جنگ مُوتہ

حضرت جعفرؓ بن ابی طالب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سگے چچازاد بھائی تھے حضرت ابو طالبؓ کے سب سے بڑے بیٹے کا نام طالب تھا اُن سے دس سال چھوٹے حضرت عقیلؓ اور اُن سے دس سال چھوٹے حضرت جعفرؓ تھے اور پھر حضرت شیر خدا علیؓ مرتضیٰ اپنے حقیقی بھائی حضرت جعفر سے بھی سن میں دس برس چھوٹے تھے۔

حضورؐ کی بعثت اور اعلان نبوت کے بعد ۵ھ (نبوی) سے مُلک حَبش کی طرف مسلمانوں کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا۔ مکہ کی سرزمین مسلمانوں کے لیئے تنگ ہو چکی تھی۔ مشرکوں نے خود حضورؐ انور اور آپ کے تمام صحابہؓ اور گھر والوں پر تکلیف اور اذیت پہنچانے کا سلسلہ اسقدر سخت اور تیز کر دیا تھا کہ آخر حضورؐ نے مسلمانوں کو اس کی اجازت دیدی کہ وہ مکہ سے حَبش کی طرف ہجرت کر کے چلے جائیں

تاکہ وہاں انھیں کچھ سکون اور اطمینان میسّر ہو سکے۔ ان ہجرت کرنے والوں میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالبؓ بھی تھے اور آپ کی زوجہ حضرت اسماءؓ بنت عمیسؓ بھی تھیں۔

مکّہ کے مشرکوں نے بڑی کوشش کی کہ ان لوگوں کو ہجرت کرنے سے روک دیا جائے مگر اُن کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں اور بہت سے مسلمان وہاں جانے میں کامیاب ہو گئے جن میں حضرت جعفرؓ بھی تھے۔ اس ہجرت کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف تو کچھ مسلمانوں کو کفار و مشرکین کے ظلم سے نجات مل جائیگی اور ساتھ ہی یہ لوگ حبشہ جا کر اسلام کی تبلیغ کر سکیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حبشہ میں اسلام کی تبلیغ کا کام شروع ہو گیا۔ جب قریشِ مکّہ تک یہ خبریں پہنچیں تو وہ گھبرا گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کو دوسرے ملک کی بھی امداد حاصل ہو جائے تو ان میں طاقت پیدا ہو جائے گی اور پھر تو بالکل ہی ہم بے بس ہو جائیں گے اور یہ لوگ ہمارے قابو میں نہ رہیں گے۔

آخر انھوں نے طے کیا کہ حبشؔ کے بادشاہ نجاشیؔ کے پاس ایک وفد بھیجا جائے اور اُس سے درخواست کی جائے

کہ مسلمانوں کو وہ اپنے ملک سے خارج کردے۔ چنانچہ ایک وفد وہاں روانہ ہوا اور اُس نے نجاشی سے درخواست کی کہ وہ مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکال کر مکّہ کی طرف واپس ہونے کا حکم دیدے اس لیے کہ یہ لوگ عیسائیت اور دینِ قریش یعنی صنم پرستی دونوں ہی کے مخالف ہیں۔ یہ سُن کر نجاشی نے مسلمانوں کو اپنے دربار میں طلب کیا اور اُن سے واقعات کی تفصیل معلوم کرنا چاہی۔ مسلمانوں کی جانب سے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب ہی تھے جنہوں سے دربار شاہی میں تقریر کی اور کہا: اے بادشاہ! لوگ جہالت اور بت پرستی کا شکار تھے۔ بدکاریاں کیا کرتے تھے، آپس میں ایک دوسرے پر ظلم کرنے میں فخر کیا کرتے تھے۔ طاقت رکھنے والے لوگ ضعیفوں اور کمزوروں پر ہر قسم کی زیادتیاں کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتے تھے اور اس طرح اُن کی زندگی ذلیل وحقیر جانوروں سے بھی بدتر ہو چکی تھی۔ ایسے عالم میں اللہ نے ہم پر احسان کیا اور اپنی رحمت وکرم سے ایک پیغمبرؐ کو بھیجا جس کی عزت وشرافت سے سب ہی لوگ واقف ہیں اس نے سب کو تعلیم دی کہ پتھروں کو پوجنا چھوڑ

دیں - جھوٹ نہ بولا کریں - وعدہ کو وفا کریں، ایک دوسرے کا خون نہ بہائیں یتیموں اور بیواؤں پر رحم کریں، غریبوں کو نہ ستائیں اور ہر ایک کو اُس کا حق دیں - جرائم کے مرتکب نہ ہوں اور ہمسایہ کے لوگوں کے ساتھ عزت و محبت کا برتاؤ کریں، تکبر و غرور چھوڑ کر سب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ سگے بھائیوں کا سا سلوک کیا کریں، ایک خدا کی عبادت کریں جو تمام عالمین کا پروردگار ہے۔ اے بادشاہ! یہی نیک باتیں ان لوگوں کے نزدیک ہمارا اور اُس پیغمبرؐ کا جُرم ہے اور اسی نیک تعلیم کے بدلے میں ہم سب لوگوں کو جو اس پیغمبرؐ کے دین پر ہیں قریش کے تمام لوگ طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دیتے ہیں اور ہمارے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں اور ہمارے پیغمبرؐ کو بھی بے انتہا تکلیفیں پہنچاتے ہیں - اس کے بعد حضرتِ جعفرؓ نے سورہ مریم کی کچھ آیتوں کی تلاوت کی اور کہا اے بادشاہ! یہ اُس کلام کا کچھ حصّہ ہے جسے اللہ نے ہمارے پیغمبرؐ پر اتارا ہے - نجاشی حضرت جعفرؓ کی تقریر اور تلاوت کو سن کر رونے لگا اور اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے پھر قریش کے وفد کی طرف مڑا اور کہنے لگا کہ یہ کلام تو بالکل انجیل

توراۃ کی طرح کا ہے۔ اے قریش تم اب واپس چلے جاؤ میرے مُلک سے۔ میں ان مظلوم مسلمانوں کو یہاں سے ہرگز واپس نہیں جانے دوں گا۔"

حضرتِ سرورِ کائنات نے جمادی الاولیٰ ۸ھ ہجری میں "شام" کے شاہِ بُصریٰ کے نام ایک خط بھیجا تھا جس میں اسے اسلام لانے کی دعوت دی گئی تھی۔ بُصریٰ غسّانی عرب خاندان کے بادشاہوں کا پایۂ تخت تھا جو قیصرِ رُوم کے ماتحت رہ کر حکومت کیا کرتے تھے۔ حضورِ انور کا یہ خط لے کر حارث بن عُمیرؓ ازدی گئے تھے۔ شام کے سرحدی علاقوں میں جو عرب حکمران تھے اُن میں ایک شُرحبیل بن عَمرو غسّانی بھی تھا۔ یہ خود اور وہاں کے سب لوگ عیسائی تھے۔ شُرحبیل نے قاصدِ رسُول اللہ کو قتل کرا دیا۔ اس توہین کی سزا دینے کے لیے آنحضرتؐ نے تین ہزار مسلمانوں پر مشتمل ایک لشکر تیار کیا اور اُسے شُرحبیل اور اس کے ساتھیوں اور سرپرستوں پر حملہ کرنے کے لئے رَوانہ کیا۔ اس لشکر کی سرداری عام مؤرخین کی رائے کے مطابق زید بن حارثہ حضورؐ کے آزاد کردہ غلام کے سپرد کی گئی۔ اور آپ نے ساتھ ہی اس کا بھی اعلان فرما دیا کہ اگر زید بن حارثہ

شہید ہو جائیں تو لشکرِ اسلام کی سرداری جعفرؓ بن ابی طالب کریں گے پھر اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو علمِ لشکر عبدؓ اللہ بن رَوَاحہ کے سپرد کیا جائے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو لشکر والے اُس وقت جسے بھی مناسب سمجھیں امیر لشکر بنالیں۔ کچھ روایات ایسی بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سرداری حضورؐ نے حضرت جعفرؓ کے سپرد کی تھی پھر زیدؓ بن حارثہ اور ان کے بعد عبدؓ اللہ بن رَوَاحہ کو رئیسِ لشکر بنانے کا حکم دیا تھا غرض یہ لشکر شام کی طرف روانہ ہوا اور اُدھر جاسوسوں نے شُرَحْبِیل کو خبر دیدی اور اس نے یہ خبر سنتے ہی مسلمانوں سے مقابلہ کے لیئے ایک لاکھ فوج تیار کرلی اور ساتھ ہی خود قیصرِ روم بھی عرب قبیلوں کی لاتعداد فوج لیکر آگیا۔ تین ہزار مسلمانوں کا تقریباً دو لاکھ عرب اور شامی فوج سے مقابلہ تھا مگر قلّتِ لشکر اور اسلحہ کی کمی اور وسائل نہ ہونے کے باوجود ان بہادر مسلمانوں نے موت کے طوفان کی طرح ٹڈی دل رومی لشکر پر حملہ کر دیا۔ حضرت عبدؓ اللہ بن رَوَاحہ کہتے جاتے تھے کہ ہمارا حقیقی مقصد فتوحات کا حصول نہیں ہے بلکہ درحقیقت ہمیں تو اللہ کی راہ میں مرتبۂ شہادت حاصل کرنا ہے۔ زیدؓ بن

حارثہؓ تلواروں اور برچھیوں کے زخموں کی تاب نہ لاکر درجۂ شہادت پر فائز ہوگئے۔ تو گرتے ہوئے علم لشکر کو شیرِ خدا اور فاتح خیبر، حیدرِ صفدر کے حقیقی بھائی جعفرؓ نے سنبھالا اور بپھرے شیر کی طرح دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے حضرتِ جعفرؓ بن ابی طالب کی تلوار تھی یا ایک بجلی تھی جو قیصری سپاہ پر قہرِ الٰہی بن کر کوندرہی تھی اور یہ تنہا دشمن کی صفوں کے اندر ڈوبے ہوئے جنگ کر رہے تھے۔ اسی جوشِ جہاد میں گھوڑے سے کود پڑے اور ایک ہی ہاتھ میں گھوڑے کے پیر قلم کر ڈالے ذرا سی دیر میں کسی نے آپ کے داہنے ہاتھ پر ضرب لگائی، اُس کے کٹتے ہی ابوطالبؓ کے بہادر فرزند نے علم کو بائیں ہاتھ میں لے لیا پھر وہ بھی کٹ گیا تو دونوں کٹے ہوئے ہاتھوں سے علم کو سنبھالے رہے اور آخر مرتبۂ شہادت حاصل کیا۔ حضرت جعفرؓ طیّار کے جسم پر تلواروں اور نیزوں کے (۹۰) سے زیادہ زخم تھے۔ آپ کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے علم سنبھالا اور پھر وہ بھی شہید ہوگئے۔ اِدھر مدینہ میں مسجدِ نبویؐ کے اندر منبر پر بیٹھے ہوئے رسول اللہؐ صحابہؓ کرام کو ایک ایک کی شہادت کی اسی طرح خبر دے رہے تھے جیسے تمام

واقعات آپ کے سامنے ہورہے ہوں ۔ ان تینوں بہادروں کی شہادت کے بعد مورخوں نے مختلف باتیں لکھی ہیں ۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ فوج کی اس بے پناہ کمی کے باوجود مسلمانوں کو مکمل فتح حاصل ہوئی تھی ۔ یہ عظیم اور انقلابی جنگ شام کے مقام بَلقَاء کے قریب ایک مشہور شامی قریہ مُوتہ کے سامنے ہوئی تھی جس میں دوسرے مسلمان بہادروں کے ساتھ ہی حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے اس بے مثال جرأت و ہمت کا مظاہرہ کیا جس کی نظیر شجاعت کی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکے گی ۔

خیبر کی طرف روانگی

خیبر اُس زرخیز خطّہ کا نام ہے جو مدینۂ منوّرہ سے شام کی طرف آٹھ منزلوں پر یعنی ۹۶ میل ہے۔ یہاں یہودیوں کے قلعے تھے۔ مدینۂ منوّرہ اور اس کے گرد و نواح سے اکثر و بیشتر یہ لوگ اسی خطّہ میں آباد ہو گئے تھے یہاں اُن کے تجارتی مرکز بھی تھے اور جنگی مرکز بھی اور اپنی اسی مرکزیت کے ذریعہ سے یہ لوگ تمام جزیرہ نمائے عرب پر اپنا تسلّط جمائے ہوئے تھے۔ ان کے پاس نہ مال و دولت کی کمی تھی، نہ علم اور صنعت و حرفت کی اور نہ جنگی سامان اور افرادی طاقت کی۔ علاّمہ یاقوت الحموی نے مُعجم البُلدان میں لکھا ہے کہ اس جگہ یہودیوں کے سات قلعے تھے جنکے گرد و پیش انتہائی سرسبز علاقہ تھا جس میں کثرت سے باغ اور لہلہاتی ہوئی کھیتیاں تھیں۔ اُن سات قلعوں کے نام یہ ہیں۔ قلعۂ ناعِم

قلعۂ شِقّ، قلعۂ نَطَاۃ، قلعۂ سُلالم، قلعۂ وَطِیح، قلعۂ کُتیبہ اور قلعۂ قَمُوص - قَمُوص ایک انتہائی مستحکم اور محفوظ پہاڑ کا نام ہے جس پر پورے استحکام اور تحفظ کے تمام وسائل کے ساتھ ایک زبردست قلعہ کی تعمیر کی گئی تھی جس میں یہود کے سردار ابوالحُقَیق یہودی کا مرکز تھا - ساتھ ہی ان تمام قلعوں میں تھوڑی تھوڑی فوج بھی رہتی تھی لیکن سب سے زیادہ فوجی طاقت کا مرکز قلعۂ قَمُوص ہی تھا - علّامہ یاقُوت حَمَوِی نے مُعجم میں لکھا ہے کہ یہودیوں کی زبان یعنی عِبرانی میں خیبر کا لفظ خود ہی قلعہ کے معنی میں بولا جاتا ہے - طَبَقَات ابن سعد اور سیرت کی دوسری کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ ماہ ذیقعدہ ۶ھ ہجری میں حُدَیبیہ کی صُلح کے بعد جب سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم مدینہ منوّرہ کی طرف واپس تشریف لائے تو آپ نے وہاں پورے ماہِ ذی الحجہ میں قیام فرمایا اور محرّم ۷ھ ہجری کے ابتدائی دنوں میں بھی وہیں مقیم رہے - اُس وقت کی صورتِ حال یہ تھی کہ ایک طرف تو مسلمانوں کو قریشِ مکّہ کی طرف سے ایک لمحہ کے لیئے بھی اطمینان نہ

تھا اور اس بات کا ہر وقت کھٹکا رہا کرتا تھا کہ وہ کسی وقت بھی اُن پر حملہ کر دیں گے اور اب یہود بھی مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔ کیونکہ ان دونوں سے مسلمانوں کی زبردست لڑائیاں ہو چکی تھیں۔ خاص طور پر یہود جو بالکل پہلو ہی میں تھے اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی اسکیمیں بنانے سے ایک لمحہ کے لیئے بھی غافل نہ تھے۔

۵ھ ہجری میں جنگ اَحزَاب یعنی غزوۂ خَندَق اسی یہودی سازش کا ابتدائی نتیجہ تھا اور اس لڑائی میں شکستِ فاش اٹھانے کے بعد قریشِ مکہ اور خصوصیت کے ساتھ یہود کا غصہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ چکا تھا۔ مشہور قبائل بنو نضیر اور بنو قَینُقَاع کو جب اُن کی سازشوں کے نتیجہ میں آنحضرتؐ کے حکم سے مدینہ کے اطراف سے نکالا گیا تو یہ سب بھی خَیبَر ہی میں آباد ہو گئے تھے۔ اور اس تخریبی کوشش میں پوری طرح شریک تھے جو خیبری یہود مسلمانوں کی بیخ کنی کے سلسلہ میں شدت کے ساتھ کر رہے تھے اور یہ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ تھا کہ اگر مسلمان اس موقع پر ذرا سی بھی غفلت سے کام لیتے تو یہود اور قریشِ مکہ کی گٹھ جوڑ مسلمانوں کو

شدید ترین تباہی کا شکار بنا دیتی۔ اس جنگی صورت حال اور سیاسی ماحول کی بنا پر یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ یہ جنگ بھی قطعی طور پر اسی طرح مدافعانہ تھی جس طرح سرورِ کائنات کی دوسری جنگیں محض دفاعی حیثیت رکھتی تھیں اور کسی طرح بھی انھیں جارحانہ نہیں کہا جا سکتا۔ بخاری، طبریؔ ابن ہشام، ابن اثیرؔ، ابو الفدا، یعقوبی اور دوسرے تمام بڑے بڑے سیرت نگاروں نے اس سیاسی اور جنگی صورت حال اور خطرناک ماحول پر تبصرہ کیا ہے جس میں اُس وقت مسلمان گھرے ہوئے تھے۔ جنکے پاس نہ سامانِ جنگ کی معقول مقدار تھی۔ نہ دولت کے خزانے تھے، نہ اقتصادی خوشحالی تھی اور نہ کہیں سے مالی، جنگی یا افرادی امداد ملنے کی توقع ہی کی جا سکتی تھی جبکہ اُس وقت مسلمانوں نے اس کی کوئی ایسی مثال بھی پیش نہ کی کہ وہ کسی غیر کے آگے امداد حاصل کرنے کے لیئے دستِ سوال دراز کریں۔ اُن کا سب سے بڑا سامانِ جنگ اُن کا باہمی اتحاد اور ان کی سب سے بڑی طاقت سرورِ کائنات کی قیادتِ عظمیٰ تھی یہودیوں نے اپنی طاقت بڑھانے کے لیئے عرب کے ایک بہت ہی مشہور

اور طاقتور قبیلۂ غطفان کو بھی مسلمانوں کے خلاف اپنے ساتھ ملا لیا اور ان کی زبردست فوج بھی جنگ کے لیئے تیار کھڑی تھی ساتھ ہی عرب کے دوسرے جنگجو قبائل بھی اس سازش میں پوری شدت کے ساتھ شریک تھے۔ غرض ان انتہائی خطرناک حالات میں مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت جسمیں صرف چودہ سو سپاہی اور دو سو سوار تھے، ایک جرار لشکر سے جس کی تعداد کم سے کم دس ہزار تھی لڑنے کے لیئے مدینہ سے روانہ ہوئی۔ یہ محرم ۷ھ ہجری کے آخری ایام تھے۔ جب آپ خیبر کی جنگ کے لیئے روانہ ہوئے تو ایک خاص بات یہ ہوئی جو کبھی پہلے نہیں ہوئی کہ آپ نے اس کا اعلان فرما دیا تھا کہ "لَا یَخْرُجَنَّ مَعَنَا اِلَّا رَاغِبٌ فِی الْجِھَادِ" ہمارے ساتھ صرف وہی لوگ چلیں جو دل سے طالبِ جہاد ہوں یعنی اگر کوئی شخص جہاد کی قلبی طلب اور دلی جذبہ نہ رکھتا ہو تو وہ ہرگز ہمارے ساتھ نہ چلے۔ اس ولولۂ جہاد اور اس طریقۂ جنگ کی مثال دوسری قوموں کی پوری جنگی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حضور انور نے مدینہ پر سباع بن عُرفُطہ غفاری کو

اور بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کو نہیں بلکہ نُمَیلہ بن عبداللہ اللّیثی کو مدینۂ منوّرہ پر افسر بنایا اور پھر یہ چھوٹا سا لشکر جس میں سے ہر ایک بہادر خود ہی ایک لشکر تھا خیبر کی جنگی چٹانوں سے ٹکر لینے کے لئے روانہ ہو گیا۔ عامر ابن الاکوعؓ آگے آگے رجز پڑھتے ہوئے چل رہے تھے جس کا ترجمہ یہ ہے: "اے اللہ اگر تو ہدایت نہ کرتا تو ہم ہدایت نہ پاتے، نہ خیرات کرتے اور نہ روزے رکھتے، ہم تجھ پر فدا ہوں۔ تیرے جن احکام پر ہم عمل نہ کر سکے ان کو معاف فرما دے اور ہمیں اطمینانِ قلب کی دولت عطا فرما۔ " مقام رَجیع" میں آنحضرتؐ نے اپنا لشکر اتارا جو غَطفان اور خیبر کے درمیان میں ہے۔ یہ خبر سنتے ہی کہ راستہ میں مسلمانوں کا لشکر آگیا ہے۔ غَطفانی سب کے سب واپس چلے گئے۔

اس اسلامی تاریخ کے بے مثال لشکر کے علمدار تین تھے ایک حُباب بن مُنذِر دوسرے سَعد بن عُبادہ اور خاص لشکر اسلام اور سرورِ کائنات کا جو عَلَم مبارک تھا وہ شبرِ خدا حضرت علی مرتضیٰؑ کو عطا فرمایا گیا۔ اور یہی وہ جانِ وفا اور

پر روح شجاعت شخصیت تھی جسکے ہاتھوں قلعہ خیبر فتح ہوا۔ خیبر کے مستحکم ترین قلعۂ قموص کے انتہائی وزنی دروازہ کو بائیں ہاتھ کے ایک جھٹکے سے آپ نے اکھاڑ لیا اور اُس سے سپر کا کام لیتے رہے۔ شیر خدا نے خود فرمایا تھا کہ میں نے درِ خیبر کو جسمانی طاقت سے نہیں بلکہ ربانی طاقت سے اُکھاڑا تھا اور اس امتحانی موقع پر جب مسلمانوں کا ہر حملہ ناکام ہو چکا تھا حضرت علیؑ ہی کی بے مثال شجاعت کے نتیجہ میں خیبری یہودیوں کو شکست فاش اٹھانا پڑی اور ذوالفقار کی بجلی نے صاعقۂ موت بن کر مرحب و عنتر و حارث و یاسر اور ہجیج خیبری جیسے سرمایۂ روزگار بہادروں کی شوکت جنگ اور حوصلۂ نبرد آزمائی کو ہمیشہ کے لئے گمنامی کے غار میں دفن کر دیا۔

اِستقامت

(آیت ۳۰ / ۳۲ سورۂ حٰمٓ السّجدۃ میں خدا کا ارشاد ہے:
جس کا ترجمہ یہ ہے " جن لوگوں نے سچے دل سے اس کا اقرار کیا کہ اللہ ہمارا پروردگار ہے اور پھر وہ اپنے اس اقرار پر ثابت قدم رہے اُن پر رحمت کے فرشتے نازل ہوں گے اور کہیں گے کہ تم کچھ خوف نہ کرو اور نہ کسی بات کا غم کھاؤ اور تمہیں اُس جنّت کی بشارت ہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست تھے اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں۔ جنّت میں تمہارے لیئے ہر وہ چیز موجود ہے جسے تمہارا دل چاہے اور جو شئے بھی تم طلب کرو گے وہ تمہارے لیئے اُس میں مہیّا ہوگی۔ یہ تمہارے رحمت والے اور بخشش والے اللہ کی طرف سے تمہاری مہمانی ہے"۔

استقامت کے معنی اعتدال کے ہیں اور دوسرے معنی راستہ پر

قائم رہنے اور جمے رہنے کے ہیں اور جب ہم یہ لفظ بولتے ہیں تو ہماری یہی مراد بھی ہوتی ہے۔ مقصودِ خداوندی یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کو اختیار کر کے اور اللہ پر ایمان لاکر اس ایمان پر ہر حال میں پوری شدّت کے ساتھ ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا جائے کوئی بھی مشکل پیش ہو، ہر طرف سے مصائب کا طوفان اُٹھے، قدم قدم پر خطرہ کا سامنا ہو مگر سچا مردِ مؤمن وہی ہے جو کسی حالت میں بھی حق و دیانت کے راستہ سے قدم نہ ہٹائے اور پوری قوت کے ساتھ اس پر جما رہے۔ سورۂ احقاف میں (آیت ۱۳) خدا نے فرمایا ہے:۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔"جن لوگوں نے اللہ کو اپنا پروردگار کہا اور اس اقرار پر ثابت قدم رہے پھر تو ان کے لیئے نہ کوئی غم ہو گا اور نہ کوئی خوف" حق کی راہ میں مشکلوں کا پیش آنا اور اُن میں مردانِ خدا کی استقامت و صبر کی آزمائش اللہ کا وہ قانون ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا۔ اور جب تک ہم اس فریضۂ استقامت و صبر کی ادائیگی میں پورے نہ اتریں گے ہمیں کامیابی حاصل کرلنے کا کوئی حق نہ ہو گا۔

(آیت ۲۳) سورۂ عنکبوت میں، خدا نے فرمایا ہے، ترجمہ:۔

ہے: کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے وہ چھوڑ دیئے جائیں گے اور اُن کا امتحان نہ لیا جائے گا اور بے شک ہم نے اُن لوگوں کا بھی امتحان لیا ہے جو ان سے پہلے گذر گئے اور یقیناً اللہ سچوں کو بھی جان لیگا اور جھوٹوں کو بھی جان لے گا " یعنی ان میں سے کوئی بھی اُس کے علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔

پچھلے لوگوں کی استقامت و صبر کا جس طرح امتحان لیا گیا تھا اس کے متعدد واقعات قرآنِ حکیم نے بیان فرمائے ہیں۔ ان ہی واقعات میں بنی اسرائیل کے مشہور بادشاہ طالوت کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں شاہی اللہ کے حکم سے عطا ہوئی تھی یہ واقعہ سورۂ بقرہ میں مذکور ہے اور بتایا گیا ہے کہ "طالُوت" کے مختصر سے لشکر نے تعداد کی بے حد کمی اور پیاس کی شدت کے باوجود ظالم وجابر "جالوت" کے ٹڈی دل لشکر کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اور آخر کار کامیاب ہو گئے اور ظالم وجابر "جالُوت" کو عبرتناک شکست ہوئی۔ اس موقع پر خدا نے فرمایا ہے (البقرہ ۲۴۹) ترجمہ یہ ہے :- ایسا بہت ہوا ہے کہ اللہ کے حکم سے چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر غالب آگئی اور خدا تو ہمیشہ صبر کرنے

والو! ہی کا ساتھی ہے "طالوت" کے ساتھ چھوٹی سی ایماندار جماعت نے اللہ کو پکارا کہ ہمیں کامل صبر و تحمل عطا فرما اور میدانِ جنگ میں ہمارے قدموں کو ثبات عنایت کر، اور کفار و مشرکین کے مقابلہ میں ہمیں فتح و کامیابی دے۔ اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور اسی ایمان و ثباتِ قدم کی بدولت "طالوت" کی چھوٹی سی جماعت کو فتح مُبین حاصل ہو گئی۔

دوسرا واقعہ اصحابِ اُخدود کا ہے جسے سورۃ البروج میں ذکر کیا گیا ہے۔ یمن میں کچھ سچے ایماندار لوگ تھے جنہیں یہودیوں نے طرح طرح کی تکلیفیں دیں پھر ایک گڑھا کھود کر اُسے آگ سے بھر دیا اور اس کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ان کے مردوں عورتوں اور بچوں کو جھونک دیا گیا لیکن اس کے باوجود اُن ایمانداروں کو کوئی طاقت ان کے ایمان و یقین سے نہ ہٹا سکی قرآنِ حکیم نے اسی طرح کے کثیر واقعات کا تذکرہ کیا ہے جن میں خدا کے سچے بندوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ گرائے گئے مگر کسی مصیبت اور ظلم کی وجہ سے اُن کے ثباتِ قدم میں کبھی جنبش نہ پیدا ہو سکی۔ قدموں میں لغزش صرف اس وقت ہوا کرتی ہے جب انسان کو اس کا یقین نہ ہو کہ وہ حق پر ہے مگر جسے اس کا

یقین کامل ہو کہ وہ سچائی پر ہے اُسکے قدموں میں کبھی کمزوری پیدا نہیں ہو سکتی۔ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اہل بیتؑ اطہار اور اصحابؓ کرام پر کیسی کیسی مصیبتیں پڑیں مگر اُن کے پائے ثبات میں فرق نہ آیا۔ آنحضرتؐ اور تمام بنی ہاشم شِعب حضرت ابو طالبؑ میں تین سال تک محصور رہے اور بھوک پیاس اور طرح طرح کی مصیبتیں جھیلتے رہے لیکن کسی کی استقامت میں فرق نہ آیا۔ مکہ کی تیرہ برس کی زندگی میں رسُول اسلام اور مسلمانوں کے لیئے کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو اُٹھ رہی ہو مگر اُن کے استقلال میں فرق نہ پیدا ہو سکا مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد مشکلات میں اور بھی اضافہ ہو گیا ایک طرف اقتصادی بے سر و سامانی تھی تو دوسری طرف جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا یہاں تک کہ مدینہ کی دس برس کی مدت میں ۶۲ لڑائیوں سے زیادہ مسلمانوں کو لڑنا پڑیں۔ کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب مسلّح اور منظّم دشمنوں کی طرف سے مسلمانوں کو خطرہ نہ ہو مگر انھوں نے اپنی قِلّت اور وسائل کی انتہائی کمی کے باوجود کبھی اپنے ثبات و استقلال میں فرق نہ آنے دیا۔ حضرت بِلالؓ و خبّابؓ اور دوسرے جیالے

اصحابِ کرامؓ نے کفار کی قید میں عرصہ تک مصیبتیں جھیلیں آگ پر لٹائے گئے، سینوں پر بھاری پتھر رکھے گئے اور طرح طرح کے انسانیت سوز ظلم و ستم سہتے رہے مگر صبر و استقامت کے ساتھ حق کے راستہ پر جمے رہے اور قدمِ استقلال میں کبھی فرق نہ آنے دیا۔

دشمنانِ اسلام کے مقابلہ میں ذہنی اور مادی جنگ کے ہر میدان میں پاکستان اور اسلام کی حفاظت و حمایت کے لئے ہم سب کو پورے استقلال و ثباتِ قدم کے ساتھ اپنے جہاد کو جاری رکھنا ہے اور ہمیں ایک مرتبہ پھر دنیا کو بتانا ہے کہ فرزندانِ توحید کبھی باطل پرستوں کے سامنے نہیں جھک سکتے۔ محمد عربی کے غلام کبھی کفر و شرک کی غلامی نہیں برداشت کر سکتے۔ فاتحِ خیبر علیؓ مرتضیٰ کے شیر کبھی سامراجی بتوں کے سامنے سرنگوں نہیں ہو سکتے۔ یہ جنگ کتنی ہی خونریز ہو ملّتِ مسلمۂ پاکستان جس طرح اس وقت تک پوری بہادری اور بھرپور استقامت سے اس کا مقابلہ کرتی رہی ہے آئندہ بھی اسی استقامت سے کرتی رہے گی۔ ہمارے استقلال و ثبات کو دنیا کی

کوئی بڑی سے بڑی قوت شکست نہیں دے سکتی۔ اس لیئے کہ ہم راہِ حق میں موت کو شہادت اور ابدی زندگی سمجھتے ہیں اور باطل کی شیطانی طاقتوں سے معرکہ آرائی کو اللہ عبادت اور اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد جانتے ہیں اور اس کا یقین کامل رکھتے ہیں کہ خدائی طاقت و نصرت ہمارے ساتھ ہے، پاکستانی قوم اب عزم وجرأت کی آہنی دیوار بن چکی ہے۔ جس کو کوئی بھی تسخیر نہیں کر سکتا۔

---

۲۳ ربیع الاوّل سنہ ۱ ھ

سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی مدینہ میں ہجرت کے موقع پر تشریف آوری سے متعلق اس بات پر تمام مؤرّخین اور سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ وہ جمعہ کا دن تھا لیکن اس میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس دن ربیع الاوّل کی کونسی تاریخ تھی۔ اس کے ساتھ ہی ظاہر ہے کہ حضور مکّہ سے سیدھے مدینہ میں تشریف نہیں لائے تھے بلکہ مدینہ میں آنے سے قبل وہاں سے قریب، مقام قُبَاءؔ میں ٹھہر گئے تھے۔ یہ مقام مدینہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حضورِؐ انور نے یہاں پہنچ کر قبیلۂ بنو عَمرو بن عوفؔ کے سردار حضرت کُلثوم بن الہِدمؔ کے مکان میں قیام فرمایا تھا۔ اس بات پر بھی سیرت نگاروں کے بہت سے قول ہیں کہ قُبَاء میں آپ کا قیام کتنے روز رہا۔ علّامہ بُخاری نے اس سلسلہ

میں لکھا ہے کہ وہاں آنحضرتؐ کا قیام چودہ روز رہا تھا اور یہی قول زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے اس لیئے کہ حضورؐ نے اپنے دورانِ قیام میں مسجد قُبّاء کی تعمیر کرائی تھی اور حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام کے آنے کا بھی انتظار فرمایا تھا جو کئی روز کے بعد وہاں پہنچے تھے اور جنہیں آپ نے امانتوں کی ادائیگی اور دوسرے ضروری کاموں کے لیئے مکّہ میں چھوڑ دیا تھا اس لیئے حضورؐ کا وہاں تین چار روز قیام کرنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے اور علاّمہ بخاری کی ۱۴ روز کی روایت صحیح تر معلوم ہوتی ہے اسی کے ساتھ جیسا کہ علاّمہ شبلی نے سیرتُ النبیؐ کی جلد اوّل میں لکھا ہے، اکثر مورّخوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قُبّاء میں حضورؐ آٹھویں ربیع الاول کو تشریف لائے تھے پھر علاّمہ محمد بن موسیٰ خوارزمی نے جنکی وفات ۲۳۲ھ کے بعد ہوئی تھی، لکھا ہے کہ قُبّاء میں حضورؐ انور کی تشریف آوری جمعرات کو ہوئی تھی اور یہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ مدینہ میں تشریف لانے کے دن پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ جمعہ تھا - ان دونوں باتوں کو ملانے کے بعد صاف

نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اُس روز ۲۳ ربیع الاوّل تھی جبکہ جمعہ کا دن تھا۔ مدینۂ منورہ کی تاریخ میں اس دن سے بہتر کوئی دن قیامت تک نہیں آئے گا جب حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی سواری وہاں پہنچی تھی۔ مدینہ کی فضا نورِ نبوّت کی تیز شعاعوں سے روشن و منور تھی۔ قُبَاءؔ سے مدینہ کی آبادی تک پورے راستہ میں استقبال کرنے والوں کا بے پناہ ہجوم تھا جس میں عورتیں، مرد، بچے سب ہی اس نورِ اَوّلین کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کے لیئے بے چین تھے۔ راستہ میں انصار کے خاندانوں کی آبادیاں آتی رہیں۔ اُن میں سے ہر ایک چاہتا تھا کہ حضور اس کے یہاں قیام فرمائیں۔ یہ گھر ہے، یہ مال ہے اور یہ جان ہے! یہ سب کچھ حضورؐ ہی کا ہے!

آپ دعائے خیر دیتے تھے اور آگے بڑھ جاتے تھے۔ شہر نزدیک آگیا تو لوگوں کے جوش و خروش کی حد نہ رہی چھوٹی چھوٹی بچیّاں وَجد اور فرطِ مسرّت میں یہ اشعار پڑھ رہی تھیں:۔ طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا۔ مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ۔ کوہِ وَدَاع کی گھاٹیوں سے چودھویں رات کا چاند نکل آیا ہے۔

وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا ۔ مَادَعَا لِلّٰہِ دَاعٍ ۔ ہم پر اللہ کا شکر کرنا واجب ہے جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگتے رہیں ۔
نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِی النَّجَّارِ ۔ یَا حَبَّذَا مُحَمَّدًا مِنْ جَارٍ ۔ ہم خاندانِ نجّار کی لڑکیاں ہیں ۔ محمد (صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم) کیا اچھے پڑوسی ہیں ۔ غرض حضورؐ کی سواری شوکت و جلالِ نبوّت کے پورے کمال کے ساتھ مدینہ کی طرف جا رہی تھی اور حکم تھا کہ کوئی شخص آپ کے ناقہ کو اپنے مکان کی طرف لیجانے کی کوشش نہ کرے بلکہ اُس کی مہار کو چھوڑ دیا جائے ۔ جہاں اللہ کا حکم ہوگا وہاں یہ خود ہی ٹھہر جائے گا ۔ یہاں تک کہ وہ سب سے پہلے بنو سالم بن عوف کی اُس مسجد کے پاس رُکا جو انہوں نے پہلے سے تعمیر کر لی تھی ۔ نماز کا وقت آچکا تھا حضورؐ ناقہ سے اُترے اور یہاں پہلی نمازِ جمعہ پڑھائی ۔ نماز سے قبل آپ نے دو خطبے ارشاد فرمائے جو تاریخی حیثیت سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔ اِن خطبوں میں اسلامی نظریۂ حیات کی طرف بھرپور رہنمائی تھی اور اِن کا ایک ایک فقرہ دینِ الٰہی اور نظامِ خداوندی کا آئینہ دار تھا ۔ عام انسانی ذہن و ضمیر کو عظیم ترین اقدار و حقائق سے آگاہی

عطا ہوئی تھی اور اُسے ہر منفی رخ سے موڑ کر دینِ حق کے مُثبت راستہ پر آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ وہ قوم جو پتھروں اور کیڑوں مکوڑوں کے سامنے سجدہ ریز تھی، رنگ، خطہ اور نسل و زبان کی تفریق میں فنا تھی، جو اپنے دنیوی اقتدار کے گھمنڈ میں سرشار تھی، جسے مظلوم بے گناہوں کی فریادیں لوریاں دیکر فرشِ خواب پر سلایا کرتی تھیں۔ آج وہ ایک نئی آواز سن رہی تھی، ایک نیا تصور پا رہی تھی اور ایک نئے فکر و نظر کے رخ کو دیکھ رہی تھی جس آواز نے وادیِ بطحا اور کوہِ حرا سے ابھر کر قیامت تک آنے والے انسانوں کی قسمت کو ایک ایسے دھارے کی طرف پلٹا دیا جس میں اور صرف اسی میں اُن کی فلاح و نجات کا ہر راز پوشیدہ ہے۔

حج میں خواتین کو بال کتروانے کا حکم

مناسک حج میں قربانی کے بعد حاجیوں کو حکم ہے کہ وہ سر کے بال منڈوائیں یا کتروائیں شریعت کے احکام کے مطابق ورنہ وہ احرام سے باہر نہ ہو سکیں گے۔ یہ تو مردوں کے لیئے حکم ہے البتہ عورتیں سر کے بال منڈوانے کے حکم سے مستثنیٰ ہیں بلکہ انھیں چاہیئے کہ وہ تقصیر کریں یعنی اپنے سر کے کچھ تھوڑے بال کتر دیں۔ اُن کے لیئے سر منڈوانا حرام ہے۔ جبکہ تقصیر واجب ہے، بنیادی طور پر حلق یعنی سر منڈوانا اور تقصیر یعنی بال کتروانے کا حکم قرآنِ پاک میں موجود ہے۔ سورۂ فتح میں اللہ کا ارشاد ہے: لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ ط بیشک اللہ نے اپنے رسولؐ کو سچا خواب دکھایا واقع کے مطابق۔ تم لوگ مسجدِ حرام میں انشاء اللہ ضرور داخل ہو گے امن وامان کے ساتھ سر منڈواتے ہوئے اور بال کترواتے ہوئے اور تم کو

خوف کسی کا بھی نہ ہوگا۔

یہ خواب جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے حضورؐ انور نے صلح حُدَیبِیَہ سے قبل دیکھا جس کی تفصیل کتب سیرت میں لکھی ہوئی ہے۔

غرض خواتین کیلئے حج میں بال کتروانا اور مردوں کے لیئے سر منڈوانا یا بال کتروانے کا حکم ثابت ہے۔

سردست مجھے عورتوں کے لیئے حکم تقصیر سے بحث کرنا ہے۔ عورت کے لیئے سر کے بالوں کی اہمیت اس حکم سے ظاہر ہے کہ اُس کے لیئے سر منڈانا حرام ہے اسی کے ساتھ ہی جب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شریعت نے اس کے بالوں کا اس قدر احترام کیا ہے کہ اگر وہ خود اپنی مرضی سے کسی مصیبت میں یعنی مثال کے طور پر اُس کے کسی قریبی رشتہ دار یا اولاد کی وفات ہو جائے یا اسی طرح کا کوئی دوسرا غم ہو اور اس میں وہ اپنے بال اکھاڑ ڈالے یا کاٹ ڈالے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس گناہ پر کفّارہ ادا کرے جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ دوسری طرف جب لڑکی یا لڑکے کی ولادت ہوتی ہے تو حکم اسلام ہے کہ عقیقہ کی شرعی رسم میں بچہ کے بالوں کو سونے یا چاندی میں تولا جائے خلاصہ یہ

یہ ہوا کہ سر کے بالوں کی اہمیت ایک خاتون کے لیئے اسلام کے نزدیک مسلّم ہے۔ مگر حج و عمرہ میں ان ہی قیمتی بالوں کی تقصیر یعنی کتروا دینے کا حکم دیا گیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ایک مسلمان خاتون اپنے حسن و جمال کے اس بہترین سرمایہ یعنی سر کے بالوں کو کس خوشی کے ساتھ اللہ کی راہ میں قربان کر دیتی ہے اور کس طرح ان نازک بالوں کو جن کی حفاظت میں اور جن کی خوبصورتی اور جنکا حسن باقی رکھنے میں وہ دن رات مشغول رہتی ہے انتہائی خلوص اور جوش اطاعت کے ساتھ کتروا دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے یہ عمل مردوں کے لیئے بھی اہم ہے مگر صنف نازک کے لیئے یہ اتنی بڑی قربانی کی مثال ہے کہ کسی دوسری قوم میں نہیں ملتی اور یقیناً یہ پیروی ہے سرورِ کائنات کی اس آواز کی: "میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ صرف اللہ ہی کیلیئے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے (انعام/۱۶۲، ۱۶۳) اس تقصیر یعنی بال کتروانے کے حکم پر تمام اسلامی فرقوں کا اتفاق اور اجماع ہے لیکن تفصیلات میں اختلاف ہے جو فِرَق اسلامیہ کی فقہی کتابوں میں مذکور ہے۔ فقہِ جعفری میں سر، ڈاڑھی، مونچھ کے بال یا ناخن سے تقصیر بغیر کسی حد بندی کے ہو سکتی ہے حَلق یا تقصیر کا یہ حکم

قربانی کے بعد ہے اور اسے حدودِ منیٰ میں انجام دینا سنّت ہے اور حدودِ حرم میں ادا کرنا واجب ہے، اور بہتر یہ ہے کہ اگر مردوں نے حدودِ منیٰ کے باہر سر منڈایا ہو یا خواتین نے بال کتروائے ہوں تو ان بالوں کو حدودِ منیٰ میں پہنچکر زمین میں دفن کرا دیا جائے۔

غرض حج کی عظیم عبادت ایک سچے مسلمان مرد اور ایک سچّی مسلمان عورت کی قربانیوں کا بہترین مظہر ہے۔ اس میں وقت کی قربانی بھی ہے، مال و دولت کی قربانی بھی ہے۔ خواہشاتِ نفس کی قربانی بھی ہے اور حسن و جمال کی قربانی بھی ہے، ضبط و تحمل کا مظاہرہ بھی ہے، صبر و استقامت کی مثالیں بھی ہیں، اخوّت و برادری کے نمونے بھی ہیں اور رنگ و نسل اور خطّہ و زبان کی تفریق کے خلاف عملی جہاد ہے اور ساتھ ہی مساواتِ انسانی کا درس بھی ہے۔ اللہ کے سب بندے ایک صورت اور ایک طرح کے لباس میں صف بستہ ہوتے ہیں اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ جس طرح شہنشاہِ وقت حج کے مناسک ادا کرتا ہے اسی طرح ایک فقیر بھی اور جس طرح عام خاتون اللہ کے حکم پر اپنے سر کے بال کتروا دیتی ہے اسی طرح ایک مُلکۂ وقت اور ایک شہزادی بھی اس پر مجبور ہے کہ وہ اپنے

حسین ونازک بالوں کو مِقراض کی تیز دھار کے سپرد
کرے۔

اے اللہ! اے عالمین کے پروردگار! تیری ذات
سب سے بڑی ہے۔ ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمارے
اعمال کو قبول فرما۔

تکبّر

"تکبّر" اُس احساسِ کمال کا نام ہے جس میں دوسروں کی تحقیر و تذلیل کا جذبہ بھی شامل ہو۔ یہ بڑی صفت اُن نظریاتی بنیادوں کے لیئے انتہائی خطرناک زہر کی حیثیت رکھتی ہے جو اسلام کے نزدیک انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا حقیقی مقصد ہیں۔

آدمی کی طبیعت میں یہ بُری صفت جن باتوں سے پیدا ہو جاتی ہے وہ حُسن، دولت، جسمانی قوّت، عہدہ اور اقتدار کی طاقت، ساتھیوں کی کثرت یا علم و کمال اور کسی ہنر اور صلاحیت و قابلیت کا حصول وغیرہ ہے۔ اپنے کمال کا احساس تو کسی حد تک ہر انسان کے دل میں پیدا ہوتا ایک فطری اور پیدائشی چیز ہے لیکن اسی کے ساتھ اگر یہ احساس زیادہ بڑھ جاتا ہے تو پھر یہ انسان کی مزید ترقیوں اور کامیابیوں کی راہیں بند کرنے لگتا ہے کیونکہ اِس تصور

کے بعد کہ ہم میں اب کوئی کمی اور نقص باقی نہیں رہا ہے آگے بڑھنے اور اس سلسلہ میں مزید سعی و کوشش کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا جس کے نتیجہ میں آدمی جہاں تھا وہیں ٹھہر کر رہ جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کبھی ذاتی بڑائی اور برتری کے اس شدید احساس کے ساتھ ہی ایسا شخص دوسروں کو اپنے آپ سے کمتر اور حقیر و ذلیل بھی سمجھنے لگتا ہے۔ اسی حالت کو جس میں اپنی بڑائی کے احساس کے ساتھ دوسروں کی تحقیر و تذلیل کا بھی جذبہ شامل ہو، ہم کبر و غرور کہتے ہیں اور اسی بدترین نفسانی صفت و کیفیت کو مختلف پہلوؤں سے عملی صورت میں ظاہر کرنے کا نام "تکبّر" ہے۔ اس بدترین صفت کے جو اثرات ظاہر ہوتے ہیں وہ بے شمار ہیں۔ ابھی عرض کیا گیا کہ ایک نتیجہ تو یہی ہوتا ہے کہ انسان کی مزید تمام ترقیاں ہمیشہ کے لیئے ختم ہو جاتی ہیں اور آگے بڑھنے کے تمام راستے اس لیئے بند اور مسدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ایسا آدمی اپنے معاشرے سے الگ تھلگ بھی ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب تو صرف میں ہی سب سے اونچا اور سب سے بڑا ہوں اور دوسرے سب کے سب

میرے آگے حقیر و ذلیل اور بے حقیقت ہیں پھر اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ خود اپنے معاشرے اور قوم سے اور معاشرہ اور قوم ایسے مغرور اور متکبر انسان سے دست بردار اور ہمیشہ کے لئے بے تعلق ہو کر رہ جائے۔ پھر اسی وجہ سے باہمی تضاد اور تصادم و اختلافات کی تخلیق شروع ہو جاتی ہے جس کے ہولناک اثرات سے پورا معاشرہ متاثر ہو کر تباہی و بربادی کا شکار ہو جاتا ہے۔

جب آدمی میں "تکبر" پیدا ہو جاتا ہے تو وہ یہی چاہتا ہے کہ دوسرے سب لوگ اس کے سامنے جھکے رہیں اور اس کی بھرپور تابعداری اور اطاعت و فرماں برداری کرتے رہیں اور کوئی شخص بھی اس کے حکم کی خلاف ورزی، اس پر اعتراض اور نکتہ چینی کرلے، اس سے سرکشی کرلے اور اس کی بات کو نہ ماننے کی جرأت تک نہ کرسکے۔ پھر جب ایسے خودغرض، خودپسند اور غرور و تکبر سے بھرے ہوئے انسان کی تمنائیں پوری نہیں ہوتیں تو آپس کی نفرت شدید سے شدید تر ہو جاتی ہے۔ اسی بناء پر ظلم و تشدد، ناانصافی، حق تلفی، قتل و غارت،

اغوا کے واقعات، اخلاقی جرائم، جبر و استحصال اور طرح طرح کے دوسرے اخلاقی اور انفرادی و اجتماعی فسادات رونما ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے افراد اور پورے معاشرے کا امن و سکون ہمیشہ کے لیئے برباد ہو جاتا ہے۔ کبر و غرور ظاہری نظر میں صرف واحد اور اکیلی بری صفت ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک ننھے سے بیج کی طرح ہے جو کچھ ہی روز میں ایک بڑا درخت بن جاتا ہے۔ اور اس میں ہزاروں پتیاں اور شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں اور وہ پھیل کر ایک وسیع فضا کو گھیر لیتا ہے۔

بالکل اسی طرح جب تکبر کا بیج انسانی ضمیر میں پرورش پاتا ہے تو اس کی شاخیں پھیل کر انسان کے دل و دماغ کو پوری طرح اپنے قبضے اور گرفت میں لے لیتی ہیں اور پھر نتیجہ میں فرد اور معاشرے کی تباہی اُس کا مقدر بن جاتی ہے۔

اس بدترین اور غلط اخلاقی رجحان کے بعض پہلو قرآنِ حکیم کی ان آیات میں بیان فرمائے گئے ہیں:۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ج إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا (بنی اسرائیل/ ۳۷) اور زمین پر

اِترا کر نہ چلا کر بیشک تو نہ زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں کی لمبائی تک پہنچ سکتا ہے۔

دوسری جگہ حضرت لقمانؑ کی ان نصیحتوں کا ذکر ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے کی تھیں:۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ط إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (لقمانؑ / ۱۸) اور تم لوگوں کی طرف سے منہ نہ پھیرنا اور زمین پر اِترا کر نہ چلنا بے شک اللہ اُس آدمی کو پسند نہیں فرماتا جو مغرور اور متکبّر اور بڑا فخر کرنے والا ہو"۔

ابھی میں عرض کر چکا ہوں کہ اس مذموم صفت یعنی کبر و غرور کی بہت سی بنیادیں اور بہت سے اسباب اور عوامل ہو سکتے ہیں لیکن قرآن حکیم نے اس کا ایک ایسا جامع علاج بتا دیا ہے جس پر عمل کرنے سے اس کے تمام عوامل اور اس کی عام بنیادیں یکسر ختم ہو جاتی ہیں اور وہ ہے اللہ کا یہ ارشاد:۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ط بے شک تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت اسی کی ہے جو سب سے

زیادہ پرہیزگار ہو (الحجرات/ ۱۳)

سب جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ غرور و تکبّر کرنے والا شیطان تھا جس نے حضرتِ آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں غرور کا اظہار کیا تھا اور یہ دعوٰی کیا تھا کہ وہ حضرتِ آدمؑ سے افضل اور بہتر ہے۔ جس کے نتیجہ میں شیطان ہمیشہ کے لیئے لعنتِ خداوندی میں گرفتار ہو گیا۔ بنی نوعِ انسان کو اللہ نے اپنی آخری کتابِ مقدّس میں طرح طرح سے اور بار بار سمجھا دیا ہے کہ "تکبّر" انسانی وجود کے لیئے جس قدر بھی تباہ کُن اسباب و عوامل ممکن ہو سکتے ہیں اُن میں سب سے زیادہ تباہ کُن ہے جس کا نتیجہ دنیا و آخرت کی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

ایک حدیث میں سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: جس شخص کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبّر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اس ارشادِ رسالت کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک سچے مسلمان کی جو خاص صفتیں ہوتی ہیں اُن ہی سے اُسے جنّت میں جانے کا استحقاق حاصل ہوتا ہے پھر ظاہر ہے کہ جب "تکبّر" اُن

تمام صفات کے راستے بند کر دیتا ہے تو جنّت میں داخلہ بھی ممکن نہیں رہ سکتا۔

متکبّر انسان ہمیشہ یہی چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کے غلام رہیں اور اس کے اشاروں پر گھومتے رہیں اور اس کے سامنے دستِ ادب باندھے کھڑے رہیں۔ اسی بدترین اخلاقی رجحان کے پیشِ نظر حضورؐ انور نے فرمایا ہے: "جو شخص اس کا خواہشمند ہوگا کہ لوگ اس کے سامنے ادب سے کھڑے رہیں اسے چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنّم میں بنا لے"۔

آپ کے ایک مشہور فرمان کا خلاصہ یہ ہے کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر اور ایک رنگ والے کو دوسرے رنگ والے پر کوئی فضیلت نہیں اور اگر ہے تو صرف پرہیز گاری کی بنیاد پر۔

حضورؐ انور کی یہ حدیث مبارک بھی ہمارے سامنے موجود ہے: "اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِاَھْلِ النَّارِ کُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَکْبِرٍ"۔ لوگو! میں تمہیں بتا دوں کہ اہل جہنم کون لوگ ہیں۔ یہ وہ ہیں جو بد ذات اور ظالم ہوں اور اکڑ کر چلنے والے اور مغرور و

متکبر ہوں۔

غرض اسلام کے نزدیک عزت اور بلندی کا اصلی معیار نہ تو دولت کے انبار رہیں، نہ کرسی اقتدار ہے، نہ قومیت ورنگ وزبان ہے، نہ جسمانی طاقت اور ساتھیوں کی کثرت ہے اور نہ خوبصورت قیمتی لباس و مکان اور دوسرے اسباب زندگی کی فراوانی ہے بلکہ صرف اور محض ضمیر اور کردار کی بلندی اور نفس کی پاکیزگی اور پرہیزگاری اور اللہ کی غلامی ہے۔ اسی غلامی میں دنیا و آخرت کی ہر بلندی کا راز پنہاں ہے۔

اللہ ہم سب کو غرور و تکبر کی لعنت سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

بلند ہمتی

بلند ہمتی سے مراد یہ ہے کہ آدمی اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرنے کے لیئے جرأت سے کام لے اور کمزوری، سستی اور بزدلی کے قریب نہ جائے۔ یہی وہ انسانی کمال ہے جس سے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت علیؑ بن ابی طالب کا ارشاد ہے: "وَمَا الْمَرْءُ اِلَّا حَیْثُ یَجْعَلُ نَفْسَہٗ۔ فَکُنْ طَالِبًا فِی النَّفْسِ اَعْلَی الْمَرَاتِبِ"۔

آدمی اسی مرتبہ اور مقام کا مستحق ہوتا ہے جس کے لیے وہ اپنے نفس کو پیش کرتا ہے۔ اس لیئے تم ہمیشہ اپنے لیئے بلند ترین مرتبہ کو طلب کرتے رہو۔ ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا تھا: "قَدْرُ الرَّجُلِ عَلٰی قَدْرِ ہِمَّتِہٖ"۔ آدمی کی عزت اس کی ہمت کے بقدر ہوا کرتی ہے۔ اس لیئے بلند ہمتی ہی ایسی صفت ہے جس کے ذریعہ سے انسان کی قدر و منزلت کو تولا جاتا ہے۔ اسی مفہوم کو حضرت سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے:

"اِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰی"۔ ہر آدمی کے لیے وہی مقصد حاصل ہوتا ہے جس کا وہ ارادہ کرے ۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے: "اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اِذَا عَمِلَ اَحَدُکُمْ عَمَلاً اَنْ یُّتْقِنَہٗ"۔ اللہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی کام کو شروع کرے تو اسے درجۂ کمال تک پہنچا دے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد بغیر بلند ہمتی کے حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ بلند ہمتی کے بغیر نہ تو اعلیٰ مقصد کی تحصیل ممکن ہے اور نہ کسی غرض اور مقصد کی تکمیل ہی ہو سکتی ہے ۔ یہ انسانی نفس کی اس صفت اور کیفیت کا نام ہے جس کے بغیر وہ ترقی کے میدان میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ بزدلی اور کم ہمتی سے نہ کبھی کوئی فرد اپنے مقصد کو حاصل کر سکتا ہے اور نہ کوئی قوم کامیابی کے کے خواب دیکھ سکتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمیں اس بات کو کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ بلند ہمتی کبھی ناجائز اور غلط مقاصد اور برے اغراض کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح آدمی کے ہر عمل بلکہ کائنات کی ہر چیز میں اچھے پہلو کے ساتھ اس کا ایک برا رخ بھی ہوا کرتا ہے۔ علم حاصل کرنا اچھا ہے لیکن اگر یہی علم ناجائز اغراض کی تحصیل کا ذریعہ بنا لیا جائے تو پھر اس کی مذمت

کی جائے گی۔

سائنس کی نئی نئی ایجادیں بڑی قابلِ تعریف ہیں لیکن اسی صورت میں کہ انسانی معاشرے کی ان کے ذریعہ سے تعمیر ہوسکتی ہو اور اگر اس ترقی کو انسان کی تباہی کے لیئے استعمال کیا جائے اور بجائے تعمیر کے اس سے دنیا کی تخریب کا کام لیا جائے اور ان ایجادوں کو انسانی معاشرہ پر ظلم و نا انصافی مسلط کرنے کے لیئے استعمال کیا جائے تو یہی ان کا قابلِ نفرت پہلو ہو جائے گا۔

بس اسی طرح اپنے اعمال اور کائنات کی ہر چیز میں ہمیں دو پہلو ملتے ہیں ایک اچھا اور دوسرا برا اور قابلِ نفرت۔ ان دونوں کا بنیادی حیثیت سے ہمارے ہی اعمال و افعال سے اور ہماری ہی نیتوں اور کردار سے تعلق ہوتا ہے۔ لوہا ہتھیار کے بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہی اسلحہ کبھی چوری، ڈکیتی اور دوسرے جرائم میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جو ہر باشعور انسان کے نزدیک قابلِ نفرت و مذمت ہے۔ غرض آدمی اپنی نیت اور عمل سے ہر اچھی چیز کو برائی کا مجسمہ بنا دیتا ہے اس لیئے بلند ہمتی بھی اگرچہ بنیادی حیثیت سے بہترین صفت ہے لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ اس صفت کو کس موقع اور کس محل پر استعمال کیا گیا ہے اور وہ انسانی معاشرہ

اور فرد کی فلاح و بہبود کے لیئے کس حد تک مناسب اور مفید ہے۔
اسی کے ساتھ اس موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے ہمیں اس پر بھی غور کرنا ہوگا کہ جس انسانی نفس کی یہ صفت ہے خود وہ نفس کیا چیز ہے اور اس کی بلندی و پستی کا معیار کیا ہونا ہے اور یہ بات ہمیں خود بخود تو معلوم ہو ہی نہیں سکتی جبتک ہم آسمانی ہدایات کا سہارا نہ لیں کیونکہ ہم سب اپنے مخصوص حالات اور ماحول میں گھرے رہتے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر فرد اور ہر قوم اور ہر خطۂ زمین کے لوگ ہر چیز کی اچھائی اور برائی کے متعلق بالکل ایک دوسرے سے مختلف نظریئے رکھتے ہیں - ہر ایک کا زاویۂ فکر الگ ہے، طریقۂ خیال جدا ہے بلکہ خود ایک ہی فرد اپنی عمر، تجربہ اور حالات کے بدلنے سے اپنے نظریات کو بدل دیتا ہے اور ایک زمانہ میں وہ کسی بات کو اگر قابلِ نفرت سمجھتا ہے تو کچھ عرصہ کے بعد اسی کو محبت اور قدر کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے اس لیئے عقل ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم نفسِ انسانی کی بلندی اور پستی اور اچھائی یا برائی کا معیار مقرر کرنے کے لیئے انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے ذریعہ الٰہی ہدایات حاصل کریں اور اس کے بعد یہ بھی سمجھ لیں کہ اللہ نے انسان کو نفس کے دائرۂ فکر و عمل میں کتنی وسعت عطا فرمائی ہے اور انسان

اپنی بلند ہمتی کے ذریعہ کہاں تک آگے جا سکتا ہے اور اس کی فکر و نظر اور قوت عمل میں کہاں تک بڑھنے کی گنجائش ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ بلند ہمتی کی صفت کے مفید پہلو کو جاننے کے لئے ہمیں بنیادی طور پر بہت سی باتوں کو سمجھنا پڑے گا۔

جن میں ایک اہم ترین چیز یہ ہے کہ اس صفت کے مرکز یعنی نفس انسانی کی صلاحیتیں کیا ہیں اور اس کے حدود اختیار و اقتدار میں کتنی وسعت ہے تاکہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ بلند ہمتی کا حاصل کرنا ہمیں کس حد تک ممکن ہے۔

قرآن کریم نے جہاں ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے، کہ انسان کو وہی ملے گا جس کی وہ کوشش کرے "لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" (النجم ۳۹) اس کے ساتھ ہی انسان کی فطرت کو وجود وسیع اور عظیم صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں اور اس کے اقتدار و ارتقاء کے حدود میں جو پھیلاؤ اور سمائی ہے اسے بھی طرح طرح سے بتایا گیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ"۔ ہم نے اولاد آدمؑ کو عزت عطا کی اور ان کو خشکی اور دریا میں حمل و نقل کی آسانیاں دیں، اور اچھی اچھی چیزوں کا رزق دیا۔ پھر سورۂ

لقمان ۲۰ میں ان الفاظ کے ساتھ انسان کے دائرۂ اقتدار کی وسعت کو بیان فرمایا گیا ہے۔ "اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً۔"

کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب تمہارے لیئے مسخر اور تابع بنا دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔ یہ اور اسی طرح کی دوسری آیاتِ کریمہ پر غور کر لینے سے صاف طریقہ پر معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ اللہ نے انسان کے وجود کو کسقدر برتری عطا فرمائی ہے اور اس کے حدودِ اقتدار میں زمین و آسمان کی ہر چیز سمٹی ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں اسلام نے انسان کا جو مقام بتایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیئے بلند ہمتی کا میدان کتنا وسیع ہے۔ اس کی ہمت اور ارادہ کا تعلق زمین و آسمان کی ہر چیز سے ہو سکتا ہے۔ وہ لامحدود فضاؤں میں پرواز کر سکتا ہے، وہ ستاروں تک پہنچ سکتا ہے، وہ سمندروں کو تسخیر کر سکتا ہے وہ اپنے قدموں سے اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں کو کچل سکتا ہے بشرطیکہ وہ بلند ہمتی سے کام لے اور اپنے مقام کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ مَعَالِيَ الْأُمُوْرِ وَيُبْغِضُ سَفْسَافَهَا"۔
اللہ بلند ہمتی کے کاموں کو دوست رکھتا ہے اور کم ہمتی اور کمزوری کی باتوں کو پسند نہیں فرماتا۔ اس ارشادِ نبویؐ سے پوری طرح واضح ہو رہا ہے کہ مسلمان کو اللہ کی محبت اور پسند کا شرف اسی وقت مل سکتا ہے جب وہ اپنی نگاہ بلند رکھے اور ہمیشہ بلند ہمتی سے کام لے اور بلند ہمتی کی اس اعلیٰ صفت کو اُن ہی مقاصد کے لیے مخصوص رکھے جن کا جواز بارگاہِ خداوندی سے اس کو حاصل ہو سکتا ہو۔

معرفتِ ذات یا خود شناسی

حضور انور صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے فرمایا ہے:
مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ " جس آدمی نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے پروردگار کی معرفت حاصل کر لی۔ اس فرمانِ رسالت کا مطلب یہ ہوا کہ جو انسان اپنی ذات اور اپنے نفس سے غافل ہے وہ یقیناً اپنے پروردگار اور اپنے خالق کو بھی نہیں پہچانتا جس کے نتیجہ میں ایسا غفلت شعار انسان ہمیشہ احساسِ کمتری میں مبتلا رہ کر اپنی منزلِ ارتقاء، اپنے اصلی مقام اور مرتبہ کو نیز اپنی پیدائشی صلاحیتوں اور قوتوں کو فراموش کر دیتا ہے اور اپنی ذات سے کم حیثیت رکھنے والی مخلوق کو اپنا مالک اور اپنا آقا سمجھ کر اُس کے آگے جھک جاتا ہے اور اس کا وہ سر اور پیشانی جس کی پیدائش اللہ کے سامنے جھکنے کے لیے ہوئی ہے

دوسروں کے سامنے خم ہو جاتی ہے۔ بتوں کی پوجا، ستاروں کی پرستش اور عجیبُ الخلقت جانوروں اور کیڑوں کی پوجا اور درختوں، دریاؤں، پہاڑوں اور ہر ایسی بڑی اور ہولناک چیز کی پرستش نتیجہ ہے اِسی غفلت کا جو انسان کو اپنے اصلی مقام و مرتبہ سے اور اپنی پیدائشی صلاحیت سے ہوا کرتی ہے۔ وہ اس حقیقت کو نہیں جانتا کہ یہ پوری کائنات اور ساری مخلوقات اُسی کے لیئے بنی ہے۔ وہ اس کا سردار ہے اور زمین و آسمان کی ہر مخلوق کا مخدوم ہے۔ اُس کو اللہ نے اس کا پورا اقتدار عطا کیا ہے کہ وہ کائنات کی ہر چیز سے فائدہ اٹھائے اور اپنی مرضی کے مطابق اُس سے کام لے اس حدیث میں جس کا ابھی میں نے ذکر کیا اسی راز کی طرف انسان کو توجہ دلائی گئی ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن پاک بار بار ہمیں متوجہ کر رہا ہے۔ کہیں اس طرح: وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (اعراف) یقیناً ہم ہی نے تم کو زمین میں اقتدار عطا کیا ہے اور تمہارے لیئے تمام وسائل زندگی مہیا

کر دیئے ہیں اور کبھی ان لفظوں کے ساتھ: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (الاسراء) یقیناً ہم ہی نے آدمؑ کی اولاد کو عزت دی ہے اور اُسے بحر و بر میں آنے جانے اور سفر کرنے کے وسیلے عنایت کیئے ہیں اور پاک و پاکیزہ روزی عطا کی ہے اور اپنی کثیر مخلوق پر اُسکو فضیلت بخشی ہے اور سورۂ لقمانؑ میں اس طرح ارشاد ہوا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ بھی زمین میں ہے وہ سب اللہ نے تمہارے ہی لیئے مسخر کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں"۔ یہاں یہ چیز ہر شخص آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ اس تسخیر کا مطلب جس کا قرآن پاک نے اعلان کیا ہے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کائنات کی ساری چیزیں جیسے چاند سورج، ستارے، دریا، پہاڑ، درخت اور اسی طرح کی دوسری مخلوق انسان ہی کے حکم سے اپنے اپنے کام انجام دیتی ہیں بلکہ اس ارشاد خداوندی کا مطلب

یہ ہے کہ یہ سب چیزیں انسان ہی کے فائدے کے لیئے بنی ہیں اور وہ ان سے اپنی صلاحیت کے مطابق فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

اس بیان سے اب یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ انسان کی پیدائش میں اللہ نے اِس قدر صلاحیتیں رکھی ہیں کہ وہ کائنات کی وسعتوں میں جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ خواہ وہ سمندروں کی گہرائیاں ہوں یا فضا اور خَلا کی لامحدود پہنائیاں ہوں اور ہر اس چیز سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اُسے اپنے مقاصد کے لیئے استعمال میں لا سکتا ہے جو اُس کے لیئے پیدا کی گئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ اسطرح اپنی پاک کتاب میں انسان کے لیئے کائنات کی تسخیر کا اعلان نہ فرماتا اور یہ سب کچھ اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان اپنی ذات اور اپنے مقام و منزل کی معرفت بھی حاصل کرے اسی وقت وہ اپنے مرتبہ کو بھی سمجھ سکتا ہے اور اپنے خالق اور اپنے پروردگار کو بھی پہچان سکتا ہے۔

نہ تو زمیں کیلیئے ہے نہ آسماں کیلیئے جہاں ہے تیرے لیئے تو نہیں جہاں کیلیئے (اقبال)

اور جب وہ معرفتِ ذات کی اس منزل تک آجائیگا
تو پھر اُس کے ضمیر کی گہرائیوں سے یہ آواز ابھرے گی:

میں ندائے کُن کا مقصد ہیں تجلّیوں کا مرکز
میں ہوں شاہکارِ قدرت ہیں جہاں کا عالم ہوں

حاجتمندوں سے متعلق اسلام کی ہدایات

اللہ نے انسان کی پیدائش اِس طریقہ اور اس نظام کے تحت کی ہے کہ وہ بغیر آپس کے تعاون اور باہمی تعلقات اور میل جول کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ جہاں اس کے لیئے کھانا پینا ضروری ہے وہاں ازدواجی رشتے اور تعلیم و تربیت، لباس و مکان، حمل و نقل کے وسیلے، خرید و فروخت کی سہولت، کھیتی باڑی، صنعت و حرفت اور امن و امان کے ذرائع سبھی ضروری ہیں۔ کوئی شخص بھی خواہ وہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، کسی خطۂ زمین میں رہنے والا ہو، اِن ضروریاتِ زندگی کا محتاج ہے اور کسی حال میں بھی ان سے بچ نہیں سکتا۔ اور یہ بھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ یہ سارے کام تنہا ایک ہی شخص انجام دیدے چھوٹوں کو بڑوں کی احتیاج ہے، بڑوں کو چھوٹوں کی ضرورت ہے، محکوم نہ ہو تو کوئی حاکم کس پہ ہوگا اور اگر حاکم نہ ہو تو محکوموں اور رعیت کا انتظام کیسے چلے گا۔ زراعت کرنے والے

نہ ہوں تو غذا کس طرح حاصل ہوگی، تعلیم دینے والے نہ ہوں تو تربیت و تعلیم کا نظام کیونکر چلے گا غرض انسان اپنی پیدائش کے لحاظ سے نظامِ مدنیت کا ہر ہر قدم پر محتاج ہے اور جب تک باہمی تعاون نہ ہو انسانی زندگی کا قافلہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اسی نظامِ پیدائش کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ ہر شخص دوسروں کی امداد و اعانت کے لیئے ہر وقت تیار رہے اور کسی لمحہ میں بھی اپنے دل میں یہ خیال نہ لائے کہ وہ دوسروں سے بے نیاز ہے یا بے نیاز ہو سکتا ہے کیونکہ یہ بات پوری طرح ممکن ہے کہ آج جو شخص دوسرے خوشحال فرد سے مدد کا طالب ہے کل یہ خوشحال آدمی اسی طرح اس غریب کے سامنے سوال کیلیئے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو جائے۔ حالات اور واقعات کی یہ کروٹیں اور یہ تبدیلیاں روزانہ ہمارے سامنے آتی ہی رہتی ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ نے ہمیں ان حقیقتوں سے بار بار آگاہ فرمادیا ہے تاکہ ہم غفلت کا شکار نہ ہوں اور ان واقعات سے عبرت حاصل کرتے رہیں۔ ہم میں آپس کے تعاون کا صحیح جذبہ پیدا ہو اور ہمارا انسانی معاشرہ زیادہ سے زیادہ پرامن اور خوشحال بن سکے۔ سورۃ الضحیٰ (۹۳) میں اللہ نے فرمایا ہے:

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْ "اور سوال کرنے والے کو کبھی جھڑکا نہ کرو۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس جگہ سائل سے مراد ہر ضرورتمند ہے جو ہم سے کسی قسم کی مدد طلب کرے چاہے وہ جسمانی ہو، علم وفن سے تعلق رکھتی ہو یا مال و دولت سے۔ اس لیئے مطلب یہی ہوا کہ کسی سوال کرنے والے کو بھی کبھی جھڑکنا نہیں چاہیئے بلکہ اپنے مقدور بھر اس کی حاجت کو پورا کرنا چاہیئے۔ اور اگر یہ نہ ہوسکے تو کم از کم انتہائی نرمی اور خوش اخلاقی کے ساتھ عذر پیش کر دیا جائے۔

غرض ہمارے معاشرہ کے حاجتمندوں، غریبوں اور مصیبت زدہ لوگوں کے ہم پر حقوق ہیں جن کا ہر وقت ہمیں خیال رکھنا چاہیئے۔ اور ان کی امداد و اعانت کر کے اپنے اسلامی اور انسانی فرض کو پورا کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

سرور کائنات کا ارشاد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت کو پورا کرنے میں لگا رہیگا اور جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کی مصیبت کو دور کرنے میں اس کو مدد دیگا تو اللہ قیامت کی مصیبت کو اس سے

دور فرما دیگا ۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے :
وَاللّٰہُ فِیْ عَوْنِ عَبْدِہٖ مَا کَانَ الْعَبْدُ فِیْ عَوْنِ اَخِیْہِ ۔ اللہ اپنے بندہ کی اس وقت تک امداد فرماتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے ۔

اگر مسلمان پوری طرح اس حکم پر کاربند ہو جائیں تو پھر ملّت مُسلمہ صحیح معنی میں نوعِ انسان کی قیادت کا حق ادا کر سکتی ہے ۔

جان و مال کی حُرمت

درحقیقت اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس نے صحیح معنی میں انسان کو امن و سلامتی اور صلح و اخوت کی تعلیم دی ہے۔ قرآنی زبان میں بولے جانے والے دو لفظ "اسلام و ایمان" بنیادی طور پر اسی صلح و سلامتی اور امن دوستی کے اہم ترین نظریہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو قرآن و اسلام کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اسلام کا لفظ "سِلْمٌ" سے بنا ہے اور ایمان کا لفظ "اَمْنٌ" سے مشتق ہے۔ اس طرح جان و مال کی حُرمت اور خیالات و اعتقاد کی صحت و حفاظت کے ایک ایسے نظام کا نام اسلام ہے جو نوعِ انسان کے لئے اس طرح کے ہر تحفظ و سلامتی اور مکمل نجات و فلاح کی ضمانت دیتا ہے۔

قرآن حکیم نے صاف لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ: "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" (الحجرات ۱۰) تمام مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے

بھائی ہیں۔ ظاہر ہے کہ سچی اخوت کا تقاضا یہ کسی حال میں بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کی جان یا مال کا احترام نہ کرے بلکہ یہ اخوت اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جبکہ ایک دوسرے کے مفاد کا پورا پورا خیال رکھے اور اس کا احترام کرے۔ ایک دوسرے کو قتل کرنے والے اور ایک دوسرے کا مال لوٹنے والے، دھوکا اور فریب دینے والے کبھی آپس میں ایک دوسرے کے بھائی نہیں کہے جا سکتے۔

غرض قرآن حکیم نے مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کا بھائی کہہ کر اس برتاؤ کی تعلیم دیدی جو سچی اخوت کے مفہوم کا تقاضا ہو سکتا ہے۔ سورۂ فتح[۲۹] میں اسی بات کی طرف "رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" سے صاف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ یعنی سچے مسلمانوں کی شان یہی ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے لیے رحمدل ہوں۔ ظاہر ہے کہ رحمدلی کا تقاضا یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص دوسرے شخص کے نقصان اور اذیت و تکلیف کا خواہاں ہو اور اس کی کوشش کرے کہ اپنے دینی بھائی کو کسی طرح سے بھی نقصان پہنچائے اور اس کی

اذیت کا سبب بن جائے۔ خواہ وہ اذیت و تکلیف جان سے متعلق ہو یا مال سے۔ اسی بنیادی نظریۂ امن و سلامتی کی طرف اور اسی جذبۂ اُخوّت و محبّت کی طرف قرآن پاک میں بہت سے مقامات پر اشارہ کیا گیا ہے۔ اموال کے تحفظ سے متعلق سورۂ بقرہ ۱۸۸ میں اللہ کا ارشاد ہے: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ "تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقہ پہ نہ کھاؤ۔ اس فرمان کی وسعت میں ہر وہ طریقہ داخل ہے جو عقلی اور شرعی اور اخلاقی حیثیت سے منشاءِ خداوندی اور تعلیم نبوی کے خلاف ہو اس سے معلوم ہو گیا کہ سچا مسلمان وہی ہوگا جو کسی دوسرے کا مال باطل یعنی ناجائز اور حرام طریقوں سے نہ کھائے۔ جس طرح قرآن حکیم کی تعلیمات کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو ہر طرح کی فلاح ملے اسی طرح حضرتِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور آپ کے قول و عمل کا بھی یہی خلاصہ ہے۔ آپ کی پوری زندگی صلح پسندی اور امن دوستی کا ایک بے مثال نمونہ تھی۔ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پہ جب مقامِ عرفات میں حضورؐ کے ساتھ لاکھوں مسلمانوں کا مجمع تھا آپ اپنی اونٹنی "قصواء"

کی پشت پر سوار تھے۔ اس تاریخی موقع پر بھی حضورؐ نے مسلمانوں کو اسی امن وسلامتی اور جان و مال کی حرمت کی تعلیم دی تھی اور فرمایا تھا جس کا ترجمہ یہ ہے۔ اے انسانو! تم سب کا پروردگار ایک ہی ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہی ہے یعنی آدم علیہ السلام۔ ہاں عرب کو عجم پر، سرخ کو سیاہ پر یا سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں ہے مگر صرف تقویٰ اور پرہیزگاری کے سبب سے۔

پھر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: کُلُّ مُسْلِمٍ أَخُو الْمُسْلِمِ وَأَنَّ الْمُسْلِمِينَ إِخْوَةٌ "یعنی تمام ہی مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا: إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِي شَهْرِكُمْ هٰذَا فِي بَلَدِكُمْ هٰذَا إِلَى يَوْمِ تَلْقَوْنَ رَبَّكُمْ" بے شک تمہارے خون اور تمہارے اموال ایک دوسرے کے لیے اسی طرح محترم ہیں جیسے نویں ذی الحجہ کا یہ دن محترم ہے۔ اس محترم مہینے میں اور اس محترم شہر مکہ میں اور یہ مسلمانوں کی جان و مال کے احترام کا وہ نظریہ تھا اور وہ فرمان جو اللہ کے آخری رسولؐ نے حجۃ الوداع

کے موقع پر اپنے تاریخی اہم ترین خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا۔

صبر و استقلال

مسلمانوں کی پوری تاریخ میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں رہی ہے وہ اُن کا عزم اور صبر و استقلال ہے اور یہی وہ صفت ہے جس نے اُن کو اقوامِ عالم کی صف میں ایک ایسی بلند جگہ دیدی جس کی کوئی دوسری مثال ممکن نہیں ہے۔ ہماری تاریخ کے ابتدائی اوراق خصوصیت کے ساتھ عزم و ہمت اور صبر و استقلال کی بلند ترین مثالوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ سرورِ کائنات اور اہلِ بیت اطہار اور اصحابِ کرام کے عزم و ثبات اور صبر و ہمت کے واقعات ہمارے سامنے ہیں اور پہلے کی طرح آج بھی وہ ہمارے لیے شمعِ ہدایت ہیں۔ مسلمان کہتے ہی اُس کو ہیں جو مصائب کے طوفانوں اور آفات و شدائد کے سیلابوں کا بہادری اور بے پناہ عزم و جرأت کے ساتھ مقابلہ کرے اور ان کے سامنے کبھی سر نہ جھکائے۔ مسلمانوں کی چودہ سو سال کی تاریخ میں ہزاروں مرتبہ ان کا خون اور پانی کے سیلابوں سے

مقابلہ ہوا، آگ اور ہوا کے طوفانوں سے ٹکر ہوئی لیکن وہ ہر آزمائش میں پورے اترے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیئے جرأت و شجاعت کی زبردست مثالیں چھوڑ گئے۔ مکّہ کی ابتدائی زندگی اور طائف کے واقعات سے لیکر شعبِ ابی طالبؓ میں تین سال تک کی محصوریت اور گھرے رہنے کے بعد بھی اور بھوک پیاس کی تکلیفوں اور ناقابل تصور مصیبتوں میں جس طرح حضورؐ اکرم اور آپ کے پاکباز ساتھیوں نے جرأت و استقلال اور باہمی اتحاد و تعاون اور صبر و استقلال کا نمونہ پیش کیا وہ اپنی آپ ہی مثال ہے۔ پھر اس کے بعد کی زندگی میں بھی ہجرت سے قبل یا ہجرت کے بعد مدینہ میں جو روح فرسا اور دل ہلا دینے والے واقعات پیش آتے رہے اُن میں ثابت قدم رہنا سچے مسلمانوں ہی کا کام تھا۔ ماؤں کے سامنے اُن کے بچے ذبح ہوتے رہے۔ مشرکوں اور یہودی درندوں کے ہاتھوں آبروئیں برباد ہوتی رہیں، گھر لوٹے گئے، بستیاں نذر آتش ہوتی رہیں، بے گناہوں کا خون بے دریغ بہایا گیا، مسلمانوں کے سینوں پر بھاری بھاری چٹانیں رکھ کر ان کو آگ کے دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا گیا اور کبھی اُن کے پیروں میں رسّی باندھ کر اسی حالت میں گھسیٹا گیا اُن کے جسموں

میں کیلیں ٹھونکی گئیں، ان کے بدن کے ٹکڑے ان کی زندگی ہی میں کاٹے گئے مگر ان عزم وجرأت کے پتلوں کو کوئی مصیبت بھی متزلزل نہ کر سکی۔ ان کی زبانیں ہمیشہ صدائے حق بلند کرتی رہیں اور ان کے دلوں میں توحید وحق پرستی کے جلوے رہے، انھیں یقین تھا کہ دنیا کی یہ تمام مصیبتیں مردانِ حق اور سچے اہلِ ایمان کی قوتِ ایمانی اور جذبۂ حق آگاہی کی آزمائش اور امتحان کا ذریعہ ہوا کرتی ہیں اور مصیبتوں کی یہی وہ بے پناہ آگ ہوتی ہے جس میں ان کے ایمان کا اصلی سونا نکھرتا ہے اور ان کی آدمیت کو معراجِ سعادت کی منزل عطا کی جاتی ہے۔ یہی تو وجہ تھی کہ ہمیشہ سچّے اہل ایمان پر جس قدر مصیبتیں زیادہ پڑتی رہیں وہ بجائے دل شکستہ ہونے اور ہمت ہارنے کے اور زیادہ حوصلہ مند بنتے رہے اور ان کی ہمت وجرأت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

فرزندِ رسول حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے لرزہ خیز واقعات ہم ہر سال سنتے ہی رہتے ہیں اور ان کے عزم واستقلال کی یادگار مثال ہمارے سامنے ہے لیکن ان واقعات میں بڑی ہی معنی خیز وہ روایات ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ کربلا کے ہولناک اور قیامت خیز طوفانِ مصائب میں

فرزندِ رسولؐ کی یہ حالت تھی کہ جس قدر مصائب آپ پر بڑھتے تھے اسیقدر آپؐ کے چہرۂ اقدس کی رونق اور شادابی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو سچا مؤمن ہو گا وہ شدائد و مصائب و آفاتِ ارضی و سماوی کے کسی سخت سے سخت تر موقع پر بھی اپنے حواس کو نہیں کھوتا، اپنی قوّتِ ایمانی میں کمزوری نہیں آنے دیتا اور اپنے خدا اور رسولؐ کو نہیں بھولتا۔ پاکستان جب سے وجود میں آیا ہے اب تک اس کو سینکڑوں مصیبتوں اور امتحانوں سے گذرنا پڑا ہے۔ مگر بہادر ملّتِ اسلامیۂ پاکستان نے ہر مصیبت کا بے جگری اور صبر سے مقابلہ کیا اس لیے کہ اسے یہ بات معلوم ہے کہ جس طرح پاکستان کا وجود طوفانوں کا مقابلہ کرکے اور اُن کو زیر کرکے دنیا کے نقشہ پر اُبھرا ہے بالکل اسی طرح پاکستان کی سالمیت و بقا بھی اُس وقت تک ممکن نہ ہو گی جب تک ملّتِ اسلامیہ بھرپور جراٴت، ہمّت اور صبر و استقلال اور آپس کی یک جہتی، محبت و خلوص، ایمانی اخوّت، اسلامی برادرانہ جذبات اور باہمی تعاون سے کام نہ لے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ اس وقت پاکستان کی بیشتر آبادی سیلاب میں گھری ہوئی ہے یا اس سے متاثر ہے مگر میں اسے عذابِ الٰہی ہرگز نہیں کہہ سکتا بلکہ میں اسکو

قوت ایمانی اور جذبۂ اسلامی کی آزمائش ہی سے تعبیر کر سکتا
ہوں اس لیئے کہ میں اس حقیقت پر یقین کامل رکھتا ہوں کہ جن
لوگوں اور قوموں کو خدا عزت عطا کرنا چاہتا ہے اُن ہی کی آزمائش
بھی کرتا ہے اور اسی لیئے چودہ سو سال کی تاریخ میں مسلمانوں کو
ایسے ایسے سیلابوں اور طوفانوں سے بارہا سابقہ پڑا۔ اس قسم
کے مصائب سے دہرے فائدے حاصل ہوا کرتے ہیں۔ قوموں
کی اخلاقی اور دینی حالت سدھرتی ہے، اُن کی قوت عمل بڑھتی ہے،
اُن کا آپس کا تعاون بڑھتا ہے۔ اور باہمی اخوت و تعاون کے جذبہ
میں بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے
کی عادت پڑتی ہے۔ رحم کرنے اور دوسروں کی مصیبتوں میں
ان کے شریک حال بننے کا جذبہ اُبھرتا ہے اور انسان کی انسانی
اور ایمانی قوت اور اس کے درجہ کا امتحان ہوتا ہے۔ موت تو
ہر جاندار کا مقدر ہے، اس سے بچنا ممکن ہی نہیں ہے مگر مصیبتیں
نہ آتی رہیں تو انسان کی وہ قوتیں اُجاگر نہ ہوسکیں جن سے وہ اشرف
المخلوقات بنتا ہے یا بن سکتا ہے کائنات کی انجمن میں ریاست
و اشرفیت کا درجہ صرف گوشت اور ہڈیوں کے ڈھانچہ کا نام ہرگز
نہیں ہے بلکہ کچھ بلند صفات سے عبارت ہے جن میں صبر و استقلال

کو بڑی بنیادی حیثیت حاصل ہے بلکہ میں یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہی صبر واستقلال کی عظیم صفت ہے جو سارے انسانی صفات کی محور ہے اور جس قدر بھی انسانیت کی بلندیاں ہیں وہ سب اسی گرد چکر لگاتی ہیں۔ اللہ اور اُس کے مقدس رسولؐ نے ہمیں صبر وجرأت کی تعلیم دی ہے اور اس کا اعلان قرآن مقدس کے اوراق میں کردیا گیا ہے کہ اللہ اُن ہی بہادروں کے ساتھ ہے جو شدائد ومصائب میں پوری مستقل مزاجی کے ساتھ صبر کرتے ہیں اور اپنے ذہنی توازن اور اپنے یقین وایمان میں ذرہ برابر بھی کمزوری نہیں آنے دیتے۔

سرور دو عالم نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کی ایک مصیبت میں اس کی کسی طرح سے بھی مدد کرتا ہے تو خدا اس مدد کرنے والے کی ستّر مصیبتیں اس سے دفع فرماتا ہے۔

حضرت شیرِ خدا فرماتے ہیں "قَدرُ الرَّجُلِ عَلٰی قَدرِ ھِمَّتِہٖ" آدمی کی عزت اس کی ہمّت اور اس کے عزم کے بقدر ہوا کرتی ہے۔ اور آخر میں صرف یہی کہوں گا کہ اس وقت آپس کے سیاسی اور غیر سیاسی اختلافات کو بھول کر حکومت اور عوام سب کو

ایک جان اور ایک دل بن کر سیلاب سے متاثر ہونے والوں کی بھرپور امداد کرنا ہمارا انسانی اور اسلامی فریضہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت آپس کی یکجہتی اور تعاون کا جو جذبہ اُبھرے گا وہ پاکستان کے دائمی استحکام کا وسیلہ بن جائے گا۔ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ایک سچا مسلمان بزدلی اور آپس کی پھوٹ کو لعنت سمجھتا ہے اور اس کا اللہ کے اس فرمان پر ایمان ہوتا ہے

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آلِ عمران ۱۳۹) تم نہ کبھی غمگین ہوا کرو اور نہ کبھی ہمت ہارا کرو (یاد رکھو) کہ اگر تم سچے مؤمن ہو تو تم ہی سب سے بلند اور ہمیشہ سب پر غالب رہو گے۔

یکجہتی

انسانی معاشرہ کی فلاح و بہبود، ترقی اور خوشحالی صرف اُسی وقت ممکن ہے جب اسکے افراد میں مکمل اتحاد و اتفاق اور بھرپور یکجہتی پائی جائے بلکہ اسی میں اس کی زندگی ہے اور اس کا انتشار اور آپس کی افراتفری اس کی موت ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت عربوں میں جو نااتفاقیاں، فسادات اور لاقانونیت پھیلی ہوئی تھی وہ کون نہیں جانتا۔ اُن کے جانوروں، زمینوں اور خاندان کے معمولی جھگڑے بڑی بڑی لڑائیوں کی شکل اختیار کر کے سارے ملک اور پورے معاشرہ کے لیئے ایک مستقل آفت اور عذاب بنے ہوئے تھے۔ اور جنگ و جدال، بدامنی اور فساد کی آگ کے شعلوں میں ساری قوم لپٹی ہوئی تھی۔ ذاتی اقتدار کی بھوک، مال و دولت اور جنسی امور کی ہوس، فرقہ وارانہ رجحانات، طرح طرح کا تعصب، غرور اور شخصیت پرستی غرض ان تمام اخلاقی برائیوں اور کردار کی بیماریوں نے اُن کیلیئے

اتحاد و اتفاق اور باہمی میل جول، تنظیم، اخوت اور محبت کا کوئی تصوّر ہی باقی نہ رکھا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ جب کسی معاشرہ میں یہ بُرائیاں پیدا ہو جائیں تو پھر اس کے لیے زندگی اور ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، جب ہر طرف سے انسان خطروں میں گھرا ہوا ہو اور ہر لمحہ اس کو بے چینی، گھبراہٹ اور خوف کا سامنا ہو تو پھر وہ کس طرح زندگی کی بلند قدروں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ وہ شاخیں جو طوفانی ہواؤں کے جھکڑوں اور آندھیوں کے تھپیڑوں سے کانپ رہی ہوں ان پر آشیانے نہیں بنائے جا سکتے انسانی زندگی اور فلاح کا بنیادی تصور بھی یہی ہے۔ جب تک باہمی اتحاد اور تنظیم نہ ہو، ایک فرد کے دل میں اپنے دوسرے بھائی کے دکھ درد کا احساس نہ ہو، ذاتی فائدہ کو جماعتی اور قومی مفاد پر قربان کرنے کا جذبہ نہ پایا جاتا ہو اس وقت تک انسان نہ زندہ رہ سکتا ہے اور نہ ترقی کر سکتا ہے۔"

حضرت رسُول کریم نے ایسی ہی افراتفری کے ماحول میں اسلام کی آواز بلند فرمائی، آپ نے خاندانی رشتوں اور دوسرے تمام رشتوں سے بہت زیادہ مضبوط اور مستحکم رشتہ لوگوں کو بنایا جس میں ان کی زندگی اور ترقی، خوشحالی اور آرام، سربلندی اور

عزّت کے سارے راز پوشیدہ تھے، یہ وہ رشتہ تھا جس میں اُن کی زندگی کی تمام الجھنوں کا حل موجود تھا یہ انکی بربادی اور تباہی سے نجات حاصل کرنے کا واحد راستہ تھا۔ یہ رشتہ دین کا تھا۔ یہ رشتہ حق کا تھا، یہ رشتہ وفا اور دیانت کا تھا، یہ رابطہ سچائی اور خدا پرستی کا تھا، یہ ایمان اور اسلام کی وابستگی اور لگاؤ کا تھا' جس سے وہ لوگ جو نسلی، خاندانی، جغرافیائی، لسانی فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم ہو چکے تھے اور جو لا تعداد ٹکڑیوں اور وحدتوں میں بٹے ہوئے تھے آپس میں مل جل کر ایک ایسی وحدت میں تبدیل ہو گئے جو دنیا کے لیئے ناقابل تسخیر بن گئی۔ اس کا سبب یہی تھا کہ در حقیقت قوّت و طاقت تو صرف مرکزیّت اور وحدت ہی میں ہوتی ہے۔ تفریق اور انتشار میں نہیں ہوا کرتی۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے سب کو عالمگیر اخوّت اور برادری کے مستحکم رشتہ میں جکڑ دیا یہی توحید کا رابطہ تھا جس نے تمام مسلمانوں کے دلوں میں آپس کی محبت اور جماعتی برتری کی ایک نئی روح پھونک دی آپس کی دشمنیوں کو مٹا دیا اور اُن لوگوں میں جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہا کرتے تھے ایسی محبت اور یگانگت پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے خاندانی، نسلی اور خون کے رشتوں کو بھی اس نئے رشتہ پر قربان کرنے لگے اور سب کے

سب ایک دوسرے پر سگے بھائیوں کی طرح فدا ہونے لگے۔ اللہ کے مقدّس رسولؐ نے لوگوں کو اُس کا پیغام سنایا:۔

"وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا" (آل عمران ۱۰۳) تم سب الٰہی رشتہ کو مضبوط پکڑ لو اور آپس میں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ اور تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے (یہ اسی کی ذات ہے) جس نے تمہارے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا پھر تو تم سب بھائی بھائی بن گئے۔"

اسلام کی تہذیب اور اسلام کی تمام تر تعلیمات کی بنیاد جس ضابطۂ زندگی پر ہے اس کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ اس نعمتِ اتحاد سے فائدہ اٹھایا جائے جس کی طرف قرآنِ حکیم نے ہمکو توجہ دلائی ہے کیونکہ یہی ایک ایسا اکیلا راستہ ہے جس میں ہماری انفرادی اور اجتماعی، قومی اور ذاتی، دینی اور دنیاوی ہر طرح کی فلاح موجود ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہی ہماری حیات ہے اور اسی میں ہماری عزّت وعظمت اور قوّت و طاقت ہے۔ اور اس کے برخلاف بدنظمی، انتشار، ٹکڑیوں اور چھوٹی وحدتوں میں بکھر جانا ہماری ذاتی، قومی اور ملّی ہر طرح کی موت ہے

قرآنِ حکیم نے ہمیں بار بار انتشار اور آپس کی پھوٹ کے خطروں سے آگاہ کر دیا ہے اس لیئے اگر ہم خوشحالی چاہتے ہیں، زندگی چاہتے ہیں، ترقی اور سربلندی کے خواہشمند ہیں اور ہر اندرونی اور بیرونی خطروں سے حفاظت کے طلبگار ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ ہم الگ الگ ٹکڑیوں میں بٹ کر اپنے لیئے تباہی اور دائمی رسوائی کو دعوت نہ دیں اور ایک ایسی ٹھوس وحدت میں سمٹ جائیں جس کا تقسیم ہونا ممکن نہ ہو۔

سورۂ انفال[۴۶] میں خدا کا ارشاد ہے: وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا۔ مطلب یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسُول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑے نہ کرو ورنہ تم ہمّت ہار جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائیگی اور صبر کرتے رہو۔

سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے فرمایا ہے کہ سارے مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے میں ایک جسم کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی اگر بدن کے ایک عُضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو پورا بدن اس تکلیف کا احساس کرنے لگتا ہے۔ بس اسی طرح اسلامی معاشرہ بھی ایک بدن کی طرح ہے اور

سارے مسلمان اس کے اعضا ہیں اور سچا مسلمان وہی ہے جس کے دل میں اپنے دوسرے بھائی کی تکلیف اور دکھ درد کا احساس موجود ہو اور وہ اس کے دکھ درد کو دور کرنے کی اسی طرح سعی کرے جیسے وہ اپنے دکھ درد کو دور کرنے کے لیئے کرتا ہے ۔

ایک دوسرے موقع پر حضور نبیؐ کریم نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر لوگوں کو دکھایا اور سمجھایا کہ دیکھو جب یہ انگلیاں باہم مل جاتی ہیں تو ان میں کتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے جو اس اتحاد سے پہلے ہرگز موجود نہ تھی ۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ ہم کو بھی آپس میں یکجہتی اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہیئے تاکہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی ، قومی اور ملّی سربلندی ، سالمیّت و استحکام ، آزادی اور عظمت و وقار ہمارے دشمنوں کے لیئے ناقابلِ تسخیر بن جائے اور ہمارا معاشرہ زندگی اور ترقی کی ہر نعمت کا حقدار ہو سکے ۔

بقیع میں مزاراتِ اہلبیتؑ و اصحابؓ

مدینۂ طیبّہ کے قبرستان کا نام جنّتُ البقیع ہے "بقیع" کے لغوی معنیٰ اس مقام کے ہیں جہاں مختلف قسم کے درختوں کی جڑیں پائی جاتی ہوں۔ اس کا نام "بقیعِ غرقد" بھی ہے "غرقد" ایک خاص درخت کا نام ہے جسے علّامہ یاقوت حموی "عوسج" کہتے ہیں اور دوسرے اہلِ تحقیق درخت "غضا" کی ایک قسم بتاتے ہیں۔ اسی درخت "غرقد" کی مناسبت سے اس مقام کا نام "بقیعِ غرقد" رکھ دیا گیا۔ غرض یہ وہ جلیل القدر قبرستان ہے جہاں ہزاروں بزرگانِ دین مدفون ہیں۔ سیرت نگاروں نے بتایا ہے کہ اس میں تقریباً دس ہزار صحابۂ کرامؓ کی قبور ہیں۔ اس قبرستان کا طول ایک سو پچاس میٹر اور چوڑائی ایک سو میٹر ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاص طور پر اس قبرستان میں تشریف لا کر یہاں کے اہلِ قبور پر سلام فرماتے تھے۔ اس قبرستان

میں جو اصحابؓ کرام مدفون ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ جن بزرگوں کے مزارات کا علم ہو سکا ہے اُن کے دس مَشَاہِد ہیں۔ اُن دس میں سے ایک مُشْہَد حضرت عَبَّاسؓ بن عبد المُطَّلِبؓ عمؓ سرورِ کائنات کا ہے۔ اسی مَشْہَد میں قول مشہور کی بناء پر حضرت فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کی قبر مبارک ہے۔ اور حضرت امام حسنؑ، حضرت امام زین العابدینؑ، حضرت امام محمد باقرؑ اور حضرت امام جعفر صادق علیہم السلام کی قبور مطہرہ بھی اسی میں ہیں۔ ایک مشہد اُمّہاتُ المؤمنین جس میں حضرت خدیجۃؓ الکُبریٰ اور حضرت میمونہؓ کے علاوہ تمام دیگر ازواج مطہرات سرورِ کائنات کی قبور ہیں۔ حضرت خدیجہؓ کی قبر مکّہ کے قبرستان "مَعلاۃ" میں ہے اور حضرت میمونہؓ کی قبر مکّہ سے قریب چند میل کے فاصلہ پر مقام "سرِف" میں ہے ان دس مشاہد میں سے ایک مشہد حضرت عثمانؓ بن عفّان کا ہے جو بقیع کے شرقی حصّہ میں ہے۔ ایک مشہد حضرت سرورِ کائنات کے فرزند حضرت ابراہیمؓ کا ہے جس میں سات صحابۂ کرام مدفون ہیں۔ اسی مشہد میں بعض کے نزدیک حضرت

فاطمہؓ بنت اسد والدۂ حضرت امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب علیہ السلام کی قبر بھی ہے۔ ایک مَشہد حضرت عقیلؓ بن ابی طالب کا ہے جس میں اولاد حضرت عبدالمطلب کی بعض شخصیتیں مدفون ہیں۔ ان ہی میں حضرت عبداللہؓ بن جعفرؓ بن ابی طالبؓ بھی ہیں۔

حضرت عقیلؓ کی قبر کے متعلق راویوں میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے کہ وہ بقیع ہی میں ہے یا کسی دوسری جگہ پر ہے۔ ایک مَشہد حضرت فاطمہؓ بنتِ اسد کی طرف منسوب ہے اور کچھ لوگوں کے نزدیک آپ یہیں دفن ہیں مگر بعض کہتے ہیں کہ دراصل یہ مَشہد ان کا نہیں بلکہ مشہور صحابی رسولؐ حضرت سعدؓ بن مُعاذ کا ہے۔ ایک مَشہد حضرت صَفِیَّہؓ بنت عبدالمطلب کا ہے جو حضورؐ انور کی پھوپھی تھیں۔ اکابر فقہاءؒ و علماءؒ کی بھی اس جلیل القدر قبرستان میں قبریں ہیں۔ امام مالکؒ بھی یہیں مدفون ہیں۔ اصحابؓ کرام میں حضرت عثمانؓ بن مَظعُونؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت ابو سعید خُدریؓ جیسی جلیل ہستیاں بھی یہیں مدفون ہیں۔ اِس

قبرستان میں سب سے پیشتر حضرت عثمانؓ بن مظعونؓ مشہور صحابی اور حضورؐ کے دودھ شریک بھائی دفن ہوئے جن کی وفات غزوۂ بدر کے بعد ہوئی تھی ان کی قبر یہاں سب سے پہلی قبر تھی اس کے بعد دوسری قبر حضورؐ کے فرزند حضرت ابراہیمؑ کی بنی تھی اور پھر بعد میں دوسرے لوگوں کے دفن ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

طبقات ابن سعد اور دوسری کتابوں میں لکھا ہے کہ حضورؐ انورؐ نے اس خطۂ زمین کو اپنے اصحابؓ و اہل بیت کے لیے خود منتخب فرمایا تھا جس کے پہلے مدفون حضرت عثمانؓ بن مظعونؓ ہوئے۔ یہ بڑے عابد و زاہد صحابی تھے اور حضورؐ ان سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد آنحضرتؐ نے ان کے چہرے سے چادر ہٹا کر ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا تھا اور گریہ فرمایا تھا اور فرماتے تھے کہ ابن مظعونؓ ہمارے بہترین سلف ہیں۔ انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ ان کی زندگی میں ان کے ایک فرزند کا انتقال ہو گیا تھا

جس کے غم میں انہوں نے ترک دنیا کا ارادہ کر لیا اور اپنے گھر کے ایک گوشہ میں دن رات عبادت کرنے لگے جب حضورؐ کو خبر ہوئی تو آپ ان کے پاس تشریف لیگئے اور فرمایا (اے ابن مَظعُونؓ) اللہ نے ہمیں رُہبانیّت یعنی ترکِ دنیا کی اجازت نہیں دی ہے۔ ہماری رُہبانیّت راہِ حق میں سعی و کوشش اور جہد و عمل کا نام ہے یعنی یہ کہ ہم مصائب پر صبر و تحمّل سے کام لیں اور اپنے فرائضِ زندگی میں فرق نہ آنے دیں۔

غرض قبرستان بَقِیعؔ وہ جنّتِ اَرضی اور خطّۂ نورانی ہے،

ع۔ جس کے ہر ذرّہ میں پنہاں ہیں ہزاروں آفتاب

طہارت و پاکیزگی کی اہمیّت

طہارت و پاکیزگی کو اسلام نے جس قدر اہمیّت دی ہے اس کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں ملتی۔ قرآن حکیم نے اس سلسلہ میں مسلمانوں کو بار بار ہدایتیں دی ہیں چنانچہ سورۂ مُدَّثِّر میں اللہ نے اپنے حبیب خاص سرور دو عالم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے اس طرح خطاب فرمایا ہے: وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ یعنی اے رسُول تم اپنے کپڑے ہمیشہ پاک رکھو اور پلیدی سے دور رہو۔ یہ بات تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ حضرت خاتم الانبیاء افضل کائنات تھے اور آپ کی ذات اقدس اور آپ کی ہر چیز انتہائی پاک و پاکیزہ تھی لیکن اس کے باوجود آپ سے اس طرح کا خطابِ الٰہی ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام کے نزدیک طہارت و پاکیزگی کی بڑی اہمیّت ہے اور اس سے ہم یہ بات بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ جب

حضورِ انور جیسی پاک و پاکیزہ ہستی کو بارگاہِ خداوندی سے پاکیزہ رہنے کا حکم مل رہا ہے اور طہارت کی تاکید ہو رہی ہے، تو دوسرے کب اس سے مستثنےٰ ہو سکتے ہیں اس لئے انھیں بھی اس حکم کی تعمیل اور حضورِ انور کی پیروی میں ہر طرح صاف ستھرا اور پاک و پاکیزہ رہنا ضروری ہے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں (۲۲۲) ارشادِ الٰہی ہے: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ۔" اللہ توبہ کرنے والوں اور صاف ستھرے اور پاکیزہ لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ سورۂ توبہ میں (۱۰۸) اس طرح فرمایا گیا ہے: وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّہِّرِیْنَ" اور اللہ پاک و پاکیزہ لوگوں سے محبت فرماتا ہے۔ ان تمام آیات کا کھلا ہوا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اللہ اُن لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا اور دوست نہیں رکھتا جو گندے اور نجس ہوا کرتے ہیں۔ اس پاکیزگی اور طہارت کا تعلق انسان کے ظاہر و باطن دونوں ہی سے ہے۔ اسلام جس طرح ظاہر کو پاکیزہ رکھنے کا حکم دیتا ہے بالکل اسی طرح وہ انسان کے باطن اور اس کے نفس و کردار کی بھی پاکیزگی ضروری قرار دیتا ہے۔ کیونکہ صاف ستھرے لباس اور رہنے سہنے کی جگہ اور دوسری

ظاہری چیزوں کی صفائی اسلام کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتی جب تک انسان کا نفس اور اس کا باطن بھی صفائی اور پاکیزگی کے اُس درجہ پر نہ ہو جو اسلام چاہتا ہے۔ یہ طہارت اور صفائی و پاکیزگی کی اہمیّت ہی ہے جس کی وجہ سے ہمیں اسلام نے طرح طرح سے تطہیر کا حکم دیا ہے اور کوئی ممکن موقع ایسا نہیں چھوڑا گیا جہاں نفس اور بدن وغیرہ کی تطہیر ہو سکتی ہے اور اس کا حکم نہ دیا گیا ہو۔ اُن تمام عبادتوں میں جن میں رکوع و سجود ہو طہارت ضروری ہے۔ مسجدوں میں نجاست کی حالت میں جانا ممنوع ہے۔ اکثر و بیشتر موقعوں پر غسل کرنے کا حکم ہے وہ غسل جو واجب ہیں ان کے علاوہ کثیر مواقع پر بھی غسل کرنا مستحب اور باعث ثواب قرار دیا گیا ہے اور اس کی بے حد تاکید کی گئی ہے جن میں غسل جمعہ کو خصوصی اہمیّت حاصل ہے تاکہ لوگ پاک صاف ہو کر پورے خضوع و خشوع کے ساتھ نماز جمعہ میں شرکت کر سکیں اور اُن کے بدن یا کپڑوں کی کسی گندگی یا بدبو سے دوسرے لوگوں کو اذیّت و تکلیف نہ ہو۔ یہ سب حکم اس کی دلیل ہیں کہ اسلام نے پاکیزگی اور طہارت

کو انسانی زندگی کے لیے بنیادی طور پر بے حد اہمیت دی ہے۔ صرف جمعہ ہی نہیں بلکہ اسلام نے مسلمانوں کو ہر دن اور ہر وقت طاہر اور پاک صاف رہنے کی ہدایت اور تاکید کی ہے۔ ایک مرتبہ حضورؐ انور نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ میلے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ یہ دیکھتے ہی حضورؐ نے فرمایا:۔ کیا اس شخص کو پانی میسّر نہ تھا کہ یہ اپنے میلے کپڑے دھو لیتا اور انھیں صاف کر کے پہنتا۔ طہارت و پاکیزگی کی اہمیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ نماز جو چوبیس گھنٹوں میں پانچ مرتبہ فرض قرار دی گئی ہے اور اسی کے ساتھ تمام نوافل اور مستحب نمازیں بغیر طہارت کے نہیں ہو سکتیں اور ہر نماز پڑھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے بدن اور کپڑوں اور نماز پڑھنے کی جگہ سے گندگی اور نجاست کو دور کرے اس طرح اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اس میں پاک صاف رہنے کی عادت پیدا ہو جائے گی اور وہ پھر دوسرے وقتوں میں بھی گندگی سے دور رہے گا۔ اور صفائی و پاکیزگی کی کوشش کرتا رہے گا یعنی اس کا مزاج ہی ایسا بن جائیگا کہ وہ پھر کبھی گندگی کو برداشت نہ کر سکے۔ حدیثوں میں سو کر

اٹھنے، کھانے کے پیشتر اور کھانے کے بعد ہاتھوں اور دانتوں کی اور منہ کی صفائی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اگر ہم اس حکم پر عمل کرتے رہیں تو بہت سی بیماریوں اور جراثیم کے زہریلے اثرات سے ہمیشہ محفوظ رہ سکتے ہیں اور ایسے متعدی یعنی پھیلنے جانے والے امراض سے بھی جو نہ صرف ہماری ہی زندگی کے لیے خطرہ ثابت ہوں بلکہ ہماری وجہ سے پورے معاشرہ کو مصیبت میں مبتلا کر دیں۔ غرض ان تمام احکام میں اہم ترین بات یہ ہے کہ گندگی اور نجاست چاہے وہ کسی انسان کے اپنے بدن میں ہو، کپڑوں میں ہو یا اُس کے گرد و پیش میں ہو خود اس کی اور دوسرے تمام لوگوں کی زندگی اور صحت و عافیت کے لیئے زبردست خطرہ ہے اور اس خطرہ کو دور کرنا شرعی حیثیت سے بھی ہر شخص کے لیئے لازمی و ضروری ہے ورنہ وہ اپنی ذرا سی بھی غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے خود بھی تباہی میں پھنسے گا اور اپنے ماحول کو گندہ رکھ کر دوسروں کی بھی زندگیاں اور اُن کی صحت برباد کرنے کا باعث بنے گا اور اس دنیوی بربادی کے ساتھ ساتھ اس کو آخرت میں اللہ کے سامنے بھی اپنی اس غفلت اور لاپروائی کا جواب

دینا ہو گا اور اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔

حدیثوں میں وضاحت کے ساتھ ہر روز نہانے کے لیئے کوئی خاص حکم موجود نہیں ہے اور نہ اُس زمانہ میں جب طہارت اور صفائی کے یہ احکام دیئے گئے تھے عرلبتان جیسے ملک میں ہر جگہ یہ بات ممکن ہی تھی کیونکہ اکثر مقامات پر پانی کی کمی تھی اور اس قدر پانی کا ملنا انتہائی دشوار تھا کہ آدمی ہر روز غسل کر سکتا اور کپڑوں اور بدن کی صفائی میں روزانہ اور ہر وقت تسے آزادی اور لاپروائی کے ساتھ بہاتا رہتا لیکن اسی کے ساتھ پہلے بھی اور اب بھی عربستان میں یا جس جگہ بھی پانی کافی مقدار میں دستیاب ہو سکے وہاں روز نہانا اور زیادہ سے زیادہ اپنے بدن، اپنے کپڑوں اور اپنے گرد وپیش کو صاف اور پاکیزہ رکھنا اسلامی تعلیم کے عین مطابق ہے۔

ایک اور حدیث سے بھی طہارت وپاکیزگی کے اس اہم مفہوم کی طرف وضاحت کے ساتھ اشارہ ملتا ہے:۔

حضور انور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے مکان کے آگے کوئی نہر بہہ رہی ہو

اور اُس نہر میں وہ دن اور رات میں پانچ وقت خوب صفائی کے ساتھ نہا لیا کرے تو کیا یہ ممکن ہے کہ اُس کے بدن میں گندگی باقی رہے! بس اسی طرح جو شخص دن اور رات کی نمازیں پابندی کے ساتھ اور پورے خلوص اور تمام شرطوں کے ساتھ جن میں صفائی اور پاکیزگی بھی داخل ہے، پڑھے گا تو اُس کے بدن اور اُس کی روح میں پھر کسی قسم کی گندگی باقی نہیں رہ سکتی۔

سرورِ کائنات نے جس خوبصورت انداز میں اس مثال کے ذریعہ سے دن رات میں پانچ مرتبہ نہانے کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ خود بتا رہا ہے کہ آنحضرتؐ کے نزدیک ہر آدمی کے لیے زیادہ سے زیادہ صاف ستھرا اور پاک و پاکیزہ رہنا ضروری ہے نہ صرف اُس کی روحانی ذمّہ داریوں کے لیے بلکہ خود اس کی اور اُس کے پورے معاشرہ کی صحّت و عافیت اور بھلائی اور بہتری کے لیے بھی۔ ظاہر ہے کہ اگر ہر ہر فرد اپنی اس ذمّہ داری کا احساس رکھے اور اسے پورا کرتا رہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ پورا معاشرہ گندگی اور نجاست سے پاک ہو جائے گا کیونکہ افراد ہی سے معاشرہ

کی تشکیل ہوا کرتی ہے اور افراد کے انفرادی اعمال سے معاشرہ کا متأثر ہونا ضروری ہوتا ہے چاہے وہ اعمال اچھے ہوں یا بُرے ہوں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہمیں بحیثیت ایک مسلمان کے ہر وقت اور ہر دن صاف و پاک رہنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہیئے اور یہ کوشش کچھ خاص دنوں میں اور کچھ خاص وقتوں میں اور زیادہ بڑھا دینا چاہیئے۔ جیسے نماز کے اوقات یا جیسے جمعہ کا دن۔

فِطرَہ کے احکام

زکوٰۃُ الفِطر ۲ھ میں واجب ہوئی تھی اور اس کے بعد سے اب ہمیشہ کے لیئے اس کا ادا کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ احادیث میں اس کے ادا کرنے کی بے حد تاکید ہے اور اسے روزوں کی قبولیت کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جو مسلمان صَدَقَہ فِطر ادا کرتا ہے اس سے اللہ سال بھر کے لیئے موت کو دفع کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی معلوم رہنا چاہیئے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ جو شخص روزے رکھے صرف اسی پر فِطرَہ ادا کرنا واجب ہو اور جو نہ رکھے اس پر واجب نہ ہو بلکہ اس کا ادا کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے خواہ اس نے روزے رکھے ہوں یا نہ رکھے ہوں۔ صَدَقَہ فِطر خود اپنی طرف سے اور ان لوگوں کی طرف سے جو اپنے زیر کفالت و پرورش ہوں ادا کرنا ہوگا ان میں زیر پرورش اولاد وغیرہ سب شامل ہیں۔ اس کی ادائیگی ان لوگوں پر واجب ہوتی ہے جو شرعی

اصطلاح میں محتاج نہ ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جنکے پاس ضروری اخراجات کے علاوہ اس قدر سامان ہو جس کی مقدار نصاب زکوٰۃ کے برابر ہو اور بعض کے نزدیک اس کے وجوب میں صرف اتنا ہی کافی ہے کہ سال بھر کے اخراجات کا سہارا موجود ہو۔ شوّال کا چاند ہوتے ہی صَدَقَہ فِطر کا ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے جیسے نماز عید سے قبل ہی ادا کر دینا چاہیئے۔ سرور کائنات صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا ارشاد ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص نے نماز عید سے قبل صَدَقَہ فِطر ادا کر دیا اس کا یہ عمل درجۂ قبولیّت حاصل کرے گا۔

صَدَقَہ فِطر کی اہمیّت کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس سے غریب و نادار طبقہ کی بہت سی حاجتیں بھی پوری ہو جاتی ہیں اور خود مالدار لوگوں کے دلوں میں غریبوں کی تکلیف کا احساس بھی بیدار ہوتا ہے اور ان کو اس کا علم ہو جاتا ہے کہ کون کون لوگ امداد کے حقدار ہیں۔ آپس میں امیروں، غریبوں، بڑے اور چھوٹوں کے درمیان اخوّت و ہمدردی اور اسلامی برادری کا جذبہ اُجاگر ہوتا ہے اور پھر روزوں میں جو کوتاہی ہو گئی ہو وہ

بھی دور ہو جاتی ہے ۔ اس سلسلہ میں یہ بھی معلوم رہنا چاہیئے
کہ جو لوگ اصطلاحِ شریعت کی بنیاد پر فقیر و محتاج کہے جاتے
ہیں اور اس دائرہ کے اندر داخل ہیں اُن سے صدقۂ فطر کی
ادائیگی ساقط ہے لیکن اگر وہ کسی نہ کسی صورت سے ادا کر دیں
تو اُن کو بھی اس کا ثواب ضرور حاصل ہوگا ۔ زکوٰۃِ فطر کا مصرف
بھی وہی باتیں ہیں جو زکوٰۃِ مال کیلئے مقرر ہیں ۔ زکوٰۃِ مال کے
مصارف قرآنِ حکیم میں آٹھ (۸) بتائے گئے ہیں ۔ فقراء ،
مساکین ۔ زکوٰۃ کی وصولیابی وغیرہ کی خدمت اور اس سے
متعلق کام انجام دینے والے اور وہ لوگ جنہیں اسلام کی طرف
مائل کرنا اور ترغیب دینا ہو یا ان کے اسلام میں پختگی پیدا کرنا
ہو اسی طرح غلاموں اور اسیروں کو آزادی دلوانا یا قرض
داروں کا قرضہ ادا کرنا یا ان لوگوں کا مالی بار دفع کرنا جن پر
ضمانت وغیرہ کا کوئی بوجھ ہو مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ قرضہ یا
مالی بار جائز باتوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہو ۔ ساتواں مصرف
"سبیل اللہ" ہے ۔ اس قسم میں علماء کرام نے جہاد، حج اور
طلبۂ علمِ دین کی اعانت کا ذکر کیا ہے اور بعض نے اس کے

اندر آن تمام باتوں کو شامل کیا ہے جو موجب تقرب د اطاعت خداوندی ہوں جیساکہ علامہ کاشانی نے بدائع میں اور دوسرے علماء نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ زکوٰۃ کا آٹھواں مصرف "ابنُ السبیل" یعنی مسافر ہے جو حالتِ سفر میں محتاج ہو جائے۔ غرض زکوٰۃ مال کے یہ آٹھ مصارف ہیں جن کا شریعت نے تقرر کیا ہے اور قرآن حکیم کے سورۂ توبہ میں اللہ نے ان کا ذکر فرمایا ہے۔

یہی مصارف زکوٰۃ فطر کے بھی ہیں مگر رشتہ دار فقراء مساکین ہر حال میں مقدم ہیں۔ ایک شخص ایک فطرہ کئی مستحقوں کو تھوڑا تھوڑا بھی دے سکتا ہے اور اس کی کُل مقدار ایک ہی شخص کو بھی ادا کر سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی آدمی اپنے فطرے ایک ہی شخص کو دیدیں مگر اس حد تک کہ وہ شخص شرعاً "غنی" نہ کہلائے یعنی صاحبِ نصاب نہ ہو جائے یا محتاج کی (شرعی) اصطلاح سے خارج نہ ہو جائے۔ کیونکہ پھر اس کو فطرہ دینا جائز نہ ہوگا۔

فطرہ میں غلّہ کے بجائے اس کی قیمت بھی دی جا سکتی ہے۔ جو لوگ عیال میں داخل ہوں یا جنکا نفقہ واجب ہو

انھیں فطرہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس رقم کو ملازمین کی تنخواہوں میں بھی نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح کسی مدرسہ، مسجد، امام بارگاہ یا کسی قسم کی بھی انجمن کے فنڈ میں صدقۂ فطر کا دینا قطعاً جائز نہیں ہے۔ علومِ دینیہ حاصل کرنے والے طلبہ کی اس رقم سے امداد کی جا سکتی ہے خواہ براہ راست امداد کی جائے یا ایسے ذرائع سے جن میں کسی قسم کے غیر شرعی تصرف کا اندیشہ نہ ہو۔

اس وقت سیلاب سے متاثر ہونے والے پریشاں حال افراد بھی صدقۂ فطر کے پوری طرح مستحق ہیں۔ ان کی امداد بھی براہ راست یا ایسے انتہائی معتبر ذریعہ سے کی جا سکتی ہے جس میں غیر شرعی غلط تصرفات کا احتمال نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ فقہ حنفی میں صدقۂ فطر سادات کو دینا قطعاً ممنوع ہے مگر فقہ جعفری میں سادات کا صدقۂ فطر مستحق سادات اور غیر سادات سب ہی لے سکتے ہیں۔ لیکن غیر سادات کا فطرہ سادات نہیں لے سکتے۔

اس زمانہ میں کنٹرول کے حساب سے فقۂ جعفری

کے مطابق آٹے کی قیمت کے لحاظ سے فطرہ کی رقم احتیاطاً دو روپیہ چار آنے ہے اور فقہ حنفی کے مطابق یہ رقم احتیاطاً ایک روپیہ آٹھ آنہ ہے۔

اللہ ہم سب مسلمانوں کو احکام دین پر عمل کرنے اور حقوق عباد کو ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے نیک اعمال کو قبولیت کا شرف بخشے۔

صفائی اور پاکیزگی

اسلام نے ہر شخص کو پاک صاف رہنے کی شدت کے ساتھ ہدایت کی ہے خواہ اس صفائی اور پاکیزگی کا تعلق اس کی اپنی ذات اور اپنے جسم سے ہو یا اس کے ماحول سے ہو۔ اللہ نے قرآن کے سورۂ بقرہ[۲۲۲] میں فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ "اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور وہ صاف ستھرے لوگوں کو بھی دوست رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ اللہ ان لوگوں کو قطعاً دوست نہیں رکھتا جو گندے اور نجس ہوں اور پاک صاف نہ رہتے ہوں۔ اس صفائی اور پاکیزگی کا تعلق انسان کے ظاہر و باطن دونوں ہی سے ہوتا ہے۔ پھر ظاہر سے مراد صرف اس کا جسم اور اپنے کپڑے ہی نہیں ہیں بلکہ وہ پورا ماحول ہے جس میں وہ زندگی گذار رہا ہے یا اس کا اس ماحول سے کوئی بھی تعلق ہے۔ صفائی اور

طہارت کے اس انتہائی ضروری مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں اسلام نے بہت سے طریقے تعلیم کئے ہیں مثلاً عبادتیں کس طرح کی جائیں اور اُن کے لیے طہارت وپاکیزگی کس قدر ضروری ہے۔ اسی طرح مسجدوں میں نجاست کی حالت میں جانا اور رہنا ممنوع ہے۔ کثیر موقعوں پر غسل کرنا کبھی واجب اور کبھی مستحب ہو جاتا ہے۔ جمعہ کے دن خاص طور پر بڑی تاکید کی گئی ہے کہ نماز جمعہ سے قبل غسل کیا جائے اور پاک صاف ہو کر نماز جمعہ میں شرکت کی جائے۔ صفائی اور پاکیزگی اسلام کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ سورۂ مدثر میں اللہ کا ارشاد ہے: "وثیابک فطہر" اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھو۔ پھر یہ ظاہر بات ہے کہ جب اللہ نے کپڑوں کی پاکیزگی کا اس قدر سختی کے ساتھ حکم دیا ہے تو وہ نفس اور اخلاق کی پاکیزگی کتنی ضروری قرار دے گا۔

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ کسی شخص کو دیکھا کہ وہ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا اس کو کیا پانی میسر نہ تھا کہ یہ

اپنے کپڑے دھوکر صاف کر لیتا۔ ایک دوسری حدیث میں ہے بُنِیَ الدِّیْنُ علی النَّظَافَۃِ " دینِ اسلام کی بنیاد پاکیزگی اور طہارت پر ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے : اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ یُحِبُّ الطَّیِّبَ اللہ خود پاک ہے اور وہ پاک صاف انسان کو بھی محبوب رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص اُن احکام کی بھرپور پابندی کرے جو طہارت و پاکیزگی سے متعلق قرآن اور حدیث میں موجود ہیں تو وہ ہزار ہا بیماریوں اور خرابیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

طہارت و پاکیزگی سے متعلق تمام احکام و ہدایات میں ایک بنیادی اہم ترین رُخ یہ بھی ہے کہ گندگی کا تعلق خواہ انسان کے اپنے بدن سے ہو یا اس کے ماحول سے ہو کسی ذینت بھی وہ خود اس کی اپنی اور اس سے کسی طرح کا بھی رابطہ رکھنے والے جانداروں کی زندگی کے لیئے زبردست خطرہ بن سکتی ہے اور اس خطرے کو دور کرنا ہر مسلمان کا نہ صرف اخلاقی بلکہ شرعی اور دینی فریضہ ہے۔ اور اگر وہ اس فرض کو پورا کرنے میں ذرا بھی کوتاہی سے

کام لے گا تو وہ خود اپنی صحت اور زندگی کے ساتھ ساتھ اس پورے نقصان کا بھی ذمہ دار ہو گا جو اُس کی لاپروائی اور غفلت کی وجہ سے معاشرے کے دوسرے افراد یا کسی جاندار کو بھی پہنچے گا خواہ وہ انسان ہو یا حیوان ہو بلکہ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ ذی حیات ہو، بے روح چیزیں جیسے کتابیں، رہائشی سامان، تجارتی چیزیں اور اسی طرح کی ہزاروں ایسی چیزیں ہیں جو گندگی سے خراب اور تباہ ہو سکتی ہیں اور آدمی کے نقصان کا سبب بن سکتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ایک آدمی تنہا ایک بڑے ماحول یعنی مثلاً ایک محلہ اور ایک شہر کو صاف ستھرا نہیں رکھ سکتا لیکن یہ تو کر سکتا ہے کہ خود اپنے بدن، اپنے کپڑوں، اپنے گھر، اور گھر کے باہر بھی جس حد تک بھی اس کے لیئے آسانی سے ممکن ہو صفائی رکھے اور گندگی نہ پیدا ہونے دے تو پھر معاشرے کا ہر ہر فرد صرف اپنی یہ انفرادی ذمہ داری پوری کر دیا کرے تو نتیجہ میں یہ انفرادی کام اجتماعی شکل اختیار کر لے گا اور پورا محلہ، پورا شہر اور پورا ملک صاف ستھرا رہے گا۔

ماحول کی صفائی سے متعلق حضورؐ کا ایک ارشاد ہے۔
نظِّفُوا اَفنَاءَکُم وَسَاحَاتِکُم" تم اپنی ذاتی طہارت کے ساتھ
اپنے گھروں کے اندرونی اور بیرونی صحنوں کو بھی صاف
ستھرا رکھا کرو کیونکہ اللہ خود لطیف اور پاک ہے اور
وہ لطافت اور پاکیزگی کو دوست رکھتا ہے۔

اس کا حاصل یہی ہوا کہ حقیقی مسلمان وہی ہو سکتا
ہے جس کا ظاہر و باطن ہر گندگی سے پاک اور صاف ہو۔

افواہ طرازی

اسلام انسان کو سچائی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس سچائی کی تین صورتیں ہیں۔ عمل کی سچائی، دل کی سچائی اور زبان کی سچائی اسلامی زندگی اسی سچائی کا دوسرا نام ہے جس میں عمل، دل اور زبان کی سچائی پائی جاتی ہو۔

دل اور عمل کی سچائی اگرچہ اپنے مقام پر بڑی اہمیت رکھتی ہے اور بغیر اس کے اسلامی معاشرہ اور اسلامی زندگی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا لیکن زبان کی سچائی اس وجہ سے اور بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ اس سے پورے معاشرہ کا تعلق ہوتا ہے اور اسکے اثرات صرف ایک ہی ذات تک محدود نہیں رہتے بلکہ دوسرے لوگ بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ افواہ طرازی اسلامی زندگی کی بنیادی تعلیم یعنی زبان کی سچائی کے خلاف ہے کیونکہ اسکا مطلب یہی ہوتا ہے کہ غلط خبریں بنائی جائیں اور ان کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے شہرت دی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز اسلام کے بنیادی تصورات کے بالکل منافی اور سراسر ان کے خلاف ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ

انسان کے قول و فعل میں سچائی ہو اور دلوں کو بُرے خیالات کی گندگی سے پاک رکھا جائے۔ افواہ طرازی کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اس کے افعال و اقوال اور ارادہ و عمل میں سچائی نہ ہو۔ کیونکہ افواہ پھیلانے والا جان بوجھ کر لوگوں کو دھوکا دیتا ہے، کسی بات کو حق اور درست جانتے ہوئے اس کے خلاف دوسری باتیں مشہور کرنے کی کوشش کرتا ہے جو محض مخصوص مقاصد کی تکمیل میں اس کو مدد دے سکیں اس لیئے یہ افواہ طرازی قول و عمل اور عقیدہ کی بدترین منافقت کا نام ہے جس میں صرف ایک ہی برائی اور ایک ہی گناہ نہیں ہوتا بلکہ افواہ طرازی کرنے والا ایک ہی وقت میں کئی سنگین جرموں اور بدترین گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ ایک طرف وہ جھوٹ بولتا ہے اور خدا کی لعنت کا مستحق بنتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ (بقرہ رکوع ۱۹ (۱۵۹/۱۹)) بے شک جو لوگ ہماری نشانیوں اور ہماری ہدایات کو چھپاتے ہیں اسکے بعد کہ ہم نے اسے اپنی کتاب میں کھول کر بیان کر دیا ہے۔ ان پر خدا بھی لعنت بھیجتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں پھر (سورۂ آل عمران رکوع ۶) میں اس طرح ارشاد ہوا ہے: فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ۔ "ہم جھوٹوں پر اللہ کی لعنت

بھیجیں۔

دوسری طرف افواہ طرازی کرنے والا خیانت کے جرم کا بھی ارتکاب کرتا ہے۔ خیانت سے مراد صرف مال ہی کی خیانت نہیں ہے بلکہ اس کے مفہوم کا تعلق انسان کے ہر عمل سے ہوتا ہے اگر سچی بات کو چھپا کر جھوٹی بات کو مشہور کیا جائے تو یہ بھی خیانت کی بدترین شکل ہوگی۔ ہر انسان کا فطری حق ہے کہ اس کو سچی بات بتائی جائے اور جو شخص سچی بات سے اسے محروم رکھے گا وہ اس کے حق میں خیانت کرے گا۔ قرآن کریم میں ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا۔" بلاشبہ خدا تم کو اس کا حکم دیتا ہے کہ تم امانتوں کو ان لوگوں کے پاس پہنچا دو جو اُن کے حقدار ہیں (نساء۔ رکوع ۸، ۵ھ) کنز العمال اور دوسری حدیث کی کتابوں میں یہ روایت موجود ہے" جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں" اس لیئے یقیناً غلط کو صحیح بنا کر مشہور کرنا اور امانتداری کے خلاف اور سخت ترین خیانت ہے جس کے تباہ کن نتیجے اور اثرات صرف ایک ہی فرد تک محدود نہیں رہتے بلکہ دوسرے بے گناہ افراد بھی اس جرم کی تباہ کاری سے محفوظ نہیں رہ سکتے" اور کتنے ہی انسانوں کی زندگی اس کی وجہ سے برباد ہو جاتی ہے بلکہ چند گھر یا خاندان ہی نہیں بلکہ

شہر، ملک اور قومیں بھی نیست و نابود ہو جاتی ہیں اور اس سے بڑھ کر بھی ممکن ہے یعنی یہ کہ اس کے تباہ کن اثرات ساری دنیا کو اپنی آگ میں لپیٹ کر تباہ و برباد کر ڈالیں اور پورے انسانی معاشرے کی بنیادیں مسمار کر دیں۔ کیا ہم اسے نہیں دیکھتے کہ ایک بہت ہی معمولی سا شعلہ بستیاں کی بستیاں جلا کر خاک کر دیتا ہے حالانکہ ابتدا میں اس چنگاری اور اس شعلہ کی حیثیت ظاہر میں کچھ بھی نہیں ہوتی۔ اسی طرح افواہ طرازی بھی بدی اور تباہی کا ایک شعلہ ہے جو ابتدا میں بہت معمولی سا نظر آتا ہے اور آخر میں اس کی تباہ کاریوں کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ یہ افراد کی زندگیاں لوٹتا ہے۔ خاندانوں کو برباد کرتا ہے اور ملکوں اور قوموں کی بلندیوں کو گہرے غاروں میں ہمیشہ کیلئے دفن کر دیتا ہے۔ اسی عظیم خطرے کو سامنے رکھ کر قرآن کریم نے انسانوں کو حق گوئی اور راست گفتاری کی تعلیم دی ہے اور تفرقہ اندازی اور افواہ طرازی کی لعنت سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے قرآن کا ارشاد ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا (پارہ ۲۲ سورۂ احزاب ۷۰) اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور درست بات کہا کرو۔

"افواہ طرازی" دوسروں پر کھلا ہوا ظلم ہے کیونکہ اس سے ان کے اس فطری حق کی پامالی ہوتی ہے کہ انھیں صحیح اور سچی بات بتائی جائے کتاب اللہ

کا اعلانِ عام ہے کہ خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا (شوریٰ آیۃ ۴۰)۔ اسی مقام پر پھر آیت ۴۲ میں یہ فرمایا گیا ہے: اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ"۔ الزام تو بس انھیں پر ہوگا جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور روئے زمین پر ناحق زیادتیاں کرتے پھرتے ہیں ان ہی لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اس افواہ طرازی سے انسان کے معاشرتی نظام میں خطرناک طور پر ابتری پیدا ہوتی ہے۔ اس سے لوگوں کے حقوق، عزت اور آبرو کو نقصان پہنچتا ہے اور قطعی طور پر یہ "قولِ زُور" کی عام اصطلاح کے اندر داخل ہے جس کیلئے قرآن کا صاف اعلان موجود ہے: وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (حج رکوع ۴ آیۃ ۳۰) جھوٹی بات کے کہنے سے بچتے رہو۔ افواہ طرازی ایک ایسا گناہ ہے اور ایک ایسا برا عمل ہے جس کے ہر رخ میں اور ہر پہلو میں بے انتہا خطرے پوشیدہ ہیں اور اگر اس کی روک تھام میں ذرا بھی غفلت سے کام لیا جائے تو اس کے ہولناک نتائج سے آخر میں انسان کے کسی شعبۂ زندگی کو بھی بچانا ممکن نہیں رہتا۔ بے شک یہ سخت ترین بدی اور بدترین برائی ہے اور برائی کا پھیلانے والا، اس کو نہ روکنے والا، اس کو ترقی دینے والا یہ سب کے سب اس آیت کریمہ کے مصداق ہیں: اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (النور آیۃ ۱۹) جو

لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمانداروں میں برائی کی اشاعت ہو بے شک اُن کے لیے دنیا اور آخرت میں بڑا ہی دردناک عذاب ہے مختصر یہ کہ افواہ طرازی صرف ایک گناہ اور واحد برائی نہیں ہے بلکہ بُرائیوں کا ایک بڑا مرکز اور مجموعہ ہے۔ یہ جھوٹ کی اشاعت ہے، یہ بڑی خطرناک منافقت ہے، دوسرے انسانوں پر کھلا ہوا ظلم ہے، اُن کے ساتھ فریب اور دھوکا ہے، اپنے ضمیر اور دوسرے بے گناہ انسانوں کے احساس و شعور سے غدّاری ہے، بددیانتی کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے اور اللہ کی مشیّت اور اس کے حکم سے سرکشی ہے۔ اس واحد عظیم گناہ کی سزا اور اس کا بُرا نتیجہ صرف ایک فرد یا چند افراد ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ افواہ طرازی کرنے والا ایک ہو یا ایک سے زیادہ ہوں اُن پر اُن لاتعداد انسانوں کے گناہوں کا بوجھ بھی ہو گا جو اس افواہ طرازی کا شکار ہوں گے اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ ذٰلِک۔

فضول باتوں سے پرہیز

اسلام نے جہاں انسان کو تہذیب و تمدّن کے وہ تمام معیاری اصول بتائے ہیں جن پر اُس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا انحصار ہے ساتھ ہی اُسے اخلاقیات کے بھی ایسے درس دیئے ہیں جو اس کی زندگی کے ہر شعبہ کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اجتماعی زندگی میں جس چیز سے انسان کو ہر وقت واسطہ پڑتا ہے وہ اس کی گفتگو ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنے مطلب کو ظاہر نہیں کر سکتا اور اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا۔ کبھی گفتگو کے قائم مقام کچھ اور وسائل بھی ہو سکتے ہیں لیکن براہِ راست جو چیز اظہارِ خیال و جذبات اور اظہارِ مقاصد کا ذریعہ ہے وہ انسان کی زبان ہی ہے۔ اس زبان سے کبھی بڑے خوفناک طوفان بھی اٹھتے ہیں اور کبھی وہ طوفان کھولتا ہوا خواب بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی زبان سے آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کبھی خون کی بارش ہوتی ہے اور کبھی لاشوں کے انبار لگ

جاتے ہیں اور کبھی وہ شعلے برد و سلام بن کر امن و سلامتی کا پیغام بھی بن جاتے ہیں اور یہی تو وہ وسیلہ ہے جس سے انسان کے وہ پوشیدہ جوہر کھل کر سامنے آجاتے ہیں. جو کسی اور ذریعہ سے ظاہر نہیں ہو سکتے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں : اَلْمَرْءُ مَخْبُوْءٌ تَحْتَ لِسَانِہٖ " انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے یعنی ہر آدمی کی اصلی قابلیت و صلاحیت اور عیب و ہنر سب کچھ اس کی زبان ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ جب تک خاموش ہے پتہ نہیں چلتا کہ اس کا چال چلن، اس کی علمی اور اخلاقی حیثیت کیا ہے۔ مگر جب وہ گفتگو کرتا ہے تو اس کا فوراً پتہ چل جاتا ہے اور تاڑنے والے فوراً تاڑ جاتے ہیں کہ یہ شخص کتنے پانی میں ہے اور کس قسم کی عادتیں اور کس حد تک صلاحیت رکھتا ہے۔ قرآن پاک اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اسی لئے بار بار حسنِ کلام کی تاکید فرمائی گئی ہے اور لغو یا فضول گفتگو سے پرہیز کرنے کا حکم دیا گیا ہے. سورہ "اسراء" میں اللہ نے فرمایا ہے: "وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ"۔ اے رسولؐ میرے بندوں سے کہو کہ وہ ہمیشہ ایسی

گفتگو کیا کریں جو بہت ہی بھلی ہو۔ اسی طرح اللہ نے ایسی گفتگو سے منع فرمایا ہے جس میں فحش کلامی یا فضول گوئی کا ذرا سا بھی شائبہ موجود ہو۔ سورۂ بقرہ میں ان لفظوں کے ساتھ حسن کلام کی تعلیم دی گئی ہے۔ "وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا" یعنی لوگوں سے ایسے انداز میں اور ایسے طریقہ سے بات چیت کیا کرو جو بھلا اور اچھا ہو۔ ایک روز سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے اصحابؓ کرام کے مجمع میں جنت کا ذکر فرما رہے تھے کسی نے عرض کی: یا رسولؐ اللہ! جنت کس کو ملے گی تو آپؐ نے فرمایا کہ اسے ملے گی جس کا طریقۂ گفتگو بھلا ہو، جو بھوکوں کو کھلائے ایک دوسری حدیث میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اچھی اور بھلی بات کہنا "صدقہ" ہے یعنی ایسا کام ہے جو بارگاہ خداوندی میں تقرب کا ذریعہ بنتا ہے۔ بہر حال انسانی زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں میں طرز گفتگو اور انداز کلام کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایک صحابی نے آنحضرتؐ سے عرض کی: حضور میرے لئے کونسی چیز سب سے زیادہ خطرناک ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ تمہاری زبان ہے۔ جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے اس سلسلہ میں چند آیتیں اور بھی ہیں جن سے اس کی سختی سے ہدایت

ملتی ہے کہ آدمی کو اپنی گفتگو اُن تمام باتوں سے پاک رکھنا
چاہیئے جو اخلاقی اور دینی حیثیت سے درست اور جائز نہ ہوں۔
سورۂ اَحزاب میں اللہ کا فرمان ہے: یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا
اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا" اے ایمان والو جب کوئی بات کہو تو
درست طریقہ پہ کہا کرو۔ اسی طرح سورۂ حج میں ہے: وَاجْتَنِبُوْا
قَوْلَ الزُّوْرِ" جھوٹی بات کہنے سے ہمیشہ پرہیز رکھو۔ ظاہر ہے کہ
جسطرح قول سدید" میں ہر قسم کی درست اور معتدل گفتگو شامل ہے
"قول زور" میں بھی ہر طرح کی جھوٹی اور غلط بات شامل ہو گی۔
پھر جب انسان فضول باتیں کرے گا تو اس کی گفتگو کسی طرح
بھی ان اخلاقی برائیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتی جو اُسے قولِ
زور" میں شامل ہونے سے بچا سکیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ فضول گفتگو ہر حیثیت سے اسلامی
تہذیب اور اسلامی تعلیم کے قطعاً منافی ہے۔

بدنظمی

اسلام نے انسانی زندگی کے لئے خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی نظم و ترتیب کو ہر چیز سے زیادہ ضروری قرار دیا ہے۔ بدنظمی سے مراد یہی نہیں ہے کہ ہم صرف اپنی اجتماعی زندگی اور کسی معاشرہ میں رہنے کے فرائض کو پورا نہ کریں بلکہ بدنظمی ہماری انفرادی اور نجی زندگی کے لئے بھی کسی طرح جائز نہیں قرار دی جاسکتی بالکل اسی طرح جیسے اجتماعی حیات میں بدنظمی پیدا کرنا اور امن و سلامتی میں خلل پیدا کرنا منشائے الٰہی کے خلاف اور اسلام کی روح کے قطعاً منافی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نظم و ترتیب کی ابتدا ر تو خود اپنی ذات ہی سے شروع ہوتی ہے اگر انسان کی ذاتی زندگی بدنظمی کا شکار ہوگی تو وہ پورے معاشرہ کو اپنے زہریلے جراثیم سے متاثر کر دے گی۔ ایک ایک فرد ہی سے تو معاشرہ بنتا ہے اور یہی انفرادی زندگیاں ہوتی ہیں جو مل جل کر قومی اور ملکی زندگی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اس لیے اگر فرد کی زندگی بدنظمی سے پاک ہو کر اعتدال کے نقطہ پر آجائے تو سارا معاشرہ اور پوری جماعت منظم اور مستحکم ہو کر بدنظمی کے بدترین اور تباہ کن نتائج سے محفوظ ہو جائے۔

جانوروں کی زندگی میں بھی نظم ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پرند بھی اپنے گھونسلو میں وقت پر آتے ہیں اور وقت پر چلے جاتے ہیں، انکو اپنی غذاؤں کا استعمال بھی معلوم ہے، اور اپنے علاج کے طریقے بھی۔ اُن کی تنظیم ایسی ہے کہ بعض وقت جب ان کا دشمن نظر آجاتا ہے تو ان کی ایک معمولی سی آواز پر ان کی پوری جماعت ایک صف میں آجاتی ہے۔ انسان کو تو خدا نے تمام مخلوقات پر برتری عطا فرمائی ہے اسلئے اسکا فرض ہے کہ وہ اُن فضیلتوں اور صفات کو اختیار کرے جو اس کی شان کے لائق ہوں اور جن سے اس بات کی تصدیق ہو سکے کہ واقعی وہ افضل مخلوقات ہے کھانے پینے میں، سونے جاگنے میں، لباس میں، بات چیت کرنے میں، اوقات کی ترتیب میں اور اسی طرح کی دوسری نجی اور انفرادی باتوں میں بدنظمی انسان کی پوری زندگی کو معطل اور بیکار بنا دیتی ہے۔ سوتے ہیں تو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کام کرنے پہ آئے تو نہ صحت کا ہوش ہے نہ کھانے کی خبر ہے، رات بھر دفتر کی فائلوں کے چکر میں یا دوسری مشغولیتوں میں جاگ رہے ہیں۔ وقت پر کھانا نہیں کھاتے۔ دماغ کو کسی وقت راحت نہیں دیتے غرض انسان ایک منتظم زندگی کا دوسرا نام ہے اور اس میں بدنظمی انسانیت کے مفہوم کے قطعاً منافی ہے۔ انسان کو انسان بننا ہے تو اُس کو اپنی زندگی میں وہ نمایاں

تربیت اور تنظیم پیدا کرنا چاہیئے جو اس کی شان کے لائق ہے اس کا رہن سہن، اس کا کھانا پینا، کام کاج، محنت، مزدوری، جفاکشی، تعلیم حاصل کرنا، دماغ کو راحت دینا اور اس سے کام لینا سب ہی باتوں میں انتہائی اعتدال اور میانہ روی ہونی چاہیئے ورنہ صرف اتنی ہی بات نہیں ہے کہ اسکی زندگی میں بدنظمی محض اسکے وجود کے منافی اور اسکی انسانی نفسیات کے خلاف ہے، بلکہ یہ بدنظمی اسکی زندگی کو تباہ بھی کر دیتی ہے اور اسکے بُرے نتائج اس کے سامنے بہت جلد ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اگر ہر انسان اپنی نجی زندگی میں میانہ روی اور نظم و ترتیب قائم کر لے تو پھر معاشرہ خود بخود منظم ہو جائے گا اور پوری جماعت میں ہم آہنگی اور ترتیب پیدا ہو جائے گی۔

بدنظمی اگر خود ذاتی زندگی میں پیدا ہو جائے تو وہ بھی تباہ ہو جاتی ہے اور اگر اجتماعی زندگی میں پیدا ہو جائے تو وہ بھی برباد ہوتی ہے اسلام نے زندگی کے اس اعتدال و نظم کا جس طرح درس دیا ہے، کسی مذہب نے نہیں دیا اور یہی نظم اور اعتدال ہی تو تھا جس نے چند منتشر غریبوں اور بھوکوں اور غلامانہ زندگی بسر کرنے والوں کو جب وہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے ہدایات اور ارشادات پر کاربند ہو گئے تو عالم بھر کا سردار اور اس پورے کرۂ زمین

کا حکمران بنا دیا اور آب وہوا دخاک و آتش پر ان کے اقتدار کے سکے جما دیئے۔ ان کی انفرادی زندگیاں منظم تھیں اور ان کی جماعتی اور اجتماعی زندگی میں کوئی خلل تھا اور نہ بدنظمی تھی۔ اسلام نے انفرادی اور اجتماعی حیات کے لیئے حدود مقرر کی ہیں جنکی پابندی کرنا ہر انسانی فرد کے لیئے ضروری ہے اور ان ہی حدود اور پابندیوں کی خلاف ورزی کرنا بدنظمی ہے جو اخلاقی، اجتماعی اور مذہبی جرم ہے کوئی فرد یا معاشرہ اس کا حق نہیں رکھتا کہ وہ کسی طرح کی بھی بدنظمی پیدا کرے۔ بدنظمی یوں تو ایک جرم اور گناہ ہے لیکن اس کے محل اور حالات نیز دوسرے خصوصیات کے لحاظ سے اس جرم کی شدت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر اس بدنظمی کا اثر انسان کی ذاتی زندگی کے کسی واحد شعبہ پر پڑتا ہے، تو اس کی حیثیت دوسری ہوگی لیکن اگر اس کی پوری زندگی بدنظمی کا شکار ہو رہی ہے تو اس کی حیثیت زیادہ شدید ہوگی۔ پھر اگر اس بدنظمی اور بے اعتدالی سے کوئی گھر، خاندان یا کوئی قوم، ملک اور ساری انسانی برادری متاثر ہوتی ہو تو اس کی سنگینی کی پھر کوئی انتہا نہ رہے گی اور ایسے لوگ جو اس امن وامان میں، اس نظم اور اس پرسکون ماحول میں جو اللہ نے اپنے بندوں کو عطا کیا ہے، خلل ڈالیں اور اپنی نیز دوسروں کی زندگیاں مبتلائے مصیبت کر دیں

اور انسانی جماعت میں ابتری اور اختلال کا سبب بنیں ان سے بڑا انسانیت کا دشمن کون ہو سکتا ہے۔ بقرہ/۲۲۹، میں اللہ نے فرمایا: وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ "وہی لوگ ظالم ہیں جو خدا کی مقرر کی ہوئی پابندیوں اور حدود سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

لوگوں کے درمیان عداوت اور دشمنی ہو، خاندانی جھگڑے اور نزاعیں ہوں جن کو کبھی نہ ہونا چاہیئے اور اگر ہیں تو کبھی باقی نہ رہنا چاہیئے مگر ان تمام باتوں کے باوجود کچھ خدا کی مقرر کردہ پابندیاں ہیں جن سے تجاوز کرنا انسان کیلئے کسی طرح جائز نہیں ہے۔ (مائدہ/۸) میں خدا فرماتا ہے: وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی "تمہیں کسی گروہ کی عداوت و دشمنی کہیں اس جرم میں مبتلا نہ کر دے کہ تم ناانصافی کرنے لگو۔ ہر حال میں تم عدل سے کام لو یہی پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے۔

اسلام نے انسانی معاشرے سے بدنظمی کو مٹانے کے لیے جو بنیادی اصول بنایا ہے، وہ اخوت و محبت باہمی ہے قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ۔ تمام ایمان رکھنے والے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اگر ہم میں صحیح طور پر محبت اور اخوت اسلامی پیدا ہو جائے تو بدنظمی کا وجود باقی نہیں رہ سکتا اور ہم سب ایک جسم اور ایک جان

کی طرح زندگی بسر کریں گے۔ رسولِ امن وسلامتی حضرت سرورِ عالم کا یہی ارشاد ہے: "مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَوَاصُلِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَىٰ عُضْوٌ مِنْهُ تَدَاعَىٰ لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالْحُمَّىٰ وَالسَّهَرِ۔" آپس کی محبت والفت اور باہمی اتحاد ویگانگت میں ایمان والوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک جسم ہوتا ہے۔ جب اس کا کوئی عضو تکلیف میں ہوتا ہے تو سارا جسم اس تکلیف سے متاثر ہو جاتا ہے اور جسم بھر کی رگ رگ میں تکلیف محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہاتھ میں تکلیف ہے مگر دل بیقرار ہے، آنکھیں بند نہیں ہوتیں نیند نہیں آتی غرض اگر ایک معمولی سی خراش کسی جگہ لگ جائے یا ذرا سا کانٹا چبھ جائے تو پورا بدن ہی تڑپ اٹھتا ہے۔ یہی حال ہمارے معاشرے کا ہونا چاہیئے، ایک کی تکلیف سب کی تکلیف ہو اور ایک کی راحت سب کی راحت ہو۔ اگر اسلام کے اس بلند نظریہ پر ہر انسان اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کرے تو کبھی ہمارے معاشرے میں بدنظمی نہیں پیدا ہو سکتی اور ہماری انسانی برادری امن و عافیت کے ساتھ ہمیشہ زندگی بسر کرے گی۔

باہمی تعاون اور اسلام

باہمی تعاون یعنی آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا اور اُس کی تکلیف کو دور کرنا، اسلام کی بنیادی اہم تعلیم اور اسلامی زندگی کی ایک بڑی خصوصیت ہے اور یہی وہ صفت ہے جس نے مٹھی بھر مسلمانوں کو جن کے پاس نہ فوج تھی نہ اسلحہ تھا اور نہ مال و دولت کے خزانے تھے اور نہ کسی دوسرے کی امداد و اعانت کا سہارا ہی تھا، دنیا کی تاریخ میں ایک عظیم قوم بنا دیا اور ایک چھوٹی سی جماعت کو جو سارے دنیاوی اور مادی وسیلوں سے محروم تھی پوری انسانیت اور دنیا بھر کے لیئے ایک مثال اور ایک نمونہ قرار دے دیا۔

اسی بنیادی تعلیم کی طرف قرآنِ کریم کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط (سورۃ المائدۃ ۲) نیکی اور پرہیزگاری کی باتوں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو مگر گناہ اور ظلم کے کاموں

میں کسی کی بھی مدد نہ کرنا۔ اس طرح جتنے بھی نیک اور اچھے کام ممکن ہو سکتے ہیں اُن میں ایک شخص کا دوسرے کی امداد کرنا اسلام کے نزدیک ضروری ہے اور ایک مسلمان کے لیئے اس کے سچے اسلام کی علامت ہے۔ لیکن یہ باہمی امداد اور تعاون بس اسی حد تک قابل تعریف ہے جہاں تک اس سے انسانی معاشرہ کو فائدہ پہنچ رہا ہو اور اگر یہ تعاون کسی جرم یا گناہ کے لیئے ہو تو پھر یہ قابل تعریف نہیں ہے بلکہ انتہائی نفرت اور مذمت کے لائق بن جائیگا۔ اسی وجہ سے تعاون کے اِن دونوں پہلوؤں پر اس آیۂ کریمہ میں روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ اس بات سے لوگ آگاہ ہو جائیں کہ اس کا ایک پہلو خطرناک بھی ہے "تعاون" کے لفظ کو اگر ہم اُس کے وسیع تر معنی کی روشنی میں دیکھیں تو ہمیں ساری کائنات باہمی تعاون ہی کے اصول پر قائم نظر آئے گی کیونکہ یہ تعاون دراصل اُس ضرورت اور احتیاج کو دور کرنے کا نام ہے جو کسی چیز کو اپنے وجود اور اپنی بقا کے لیئے ہوتی ہے۔

اسی باہمی تعاون کی وجہ سے اس پوری کائنات کا نظام چل رہا ہے، اگر ایک لمحہ کے لیئے بھی یہ باقی نہ رہے تو سارے

عالم کا نظم بگڑ کر رہ جائے۔

جس طرح زمین و آسمان کا پورا نظام، مخلوقات کے باہمی تعاون سے قائم اور باقی ہے اسی طرح ہم بھی بغیر اس تعاون کے نہ زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ کسی قسم کی ترقی حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ ہم بھی تو اسی کائنات کا ایک جزو اور ایک کڑی ہیں۔ اگر کوئی اس باہمی تعاون کی اہمیت کا قائل نہ ہو تو وہ یقیناً اصول فطرت سے بغاوت کر رہا ہے اور ایسی حقیقت کا انکار کرتا ہے جو سورج کی طرح روشن ہے۔

ہم کھیت میں اناج بوتے ہیں۔ اس کام میں ہم اکیلے نہیں ہوتے ہمارے بدن کا ہر عضو اس مہم میں آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتا ہے اور کائنات کی دوسری چیزیں بھی ہمارے ساتھ تعاون کرتی ہیں پھر ہم اس قابل بنتے ہیں کہ غلّہ حاصل کر سکیں۔

ہم مکانوں کی تعمیر کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ جب تک ایک پتھر دوسرے پتھر اور ایک اینٹ دوسری اینٹ کے ساتھ تعاون نہ کرے یعنی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک نہ ہو جائے اور مل جل نہ جائے اس وقت تک کبھی کوئی مکان اور کوئی عمارت تیار نہیں ہو سکتی۔ ہمارا یہ انسانی معاشرہ بھی ایک عمارت کی طرح

ہے جو بغیر آپس کے تعاون اور باہمی ہمدردی کے نہ بن سکتی ہے اور نہ باقی رہ سکتی ہے۔

ایک فرد اپنے زندہ رہنے میں اور اپنے تمام کاموں میں ہزاروں افراد کی مدد کا محتاج ہوتا ہے اور اس کے لئے بغیر آپس کے تعاون اور باہمی امداد کے، اقتصادی، سماجی یا اور کسی طرح کی کوئی فلاح وبہبود ممکن نہیں ہو سکتی، جہاں چھوٹے اپنے بڑوں کی امداد کے محتاج ہوا کرتے ہیں تو بڑے بھی بغیر چھوٹوں کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ غریب لوگ مالداروں کے سہارے زندگی گذارتے ہیں تو دولتمند آدمی بھی اُن سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے اور قدم قدم پر ان کی مدد اور تعاون کے محتاج ہوتے ہیں۔

یہ ایک وسیع سلسلہ ہے، ایک پھیلا ہوا رشتہ ہے جس میں انسانی معاشرہ کے سارے افراد جکڑے ہوئے ہیں اور یہ وہ حقیقتیں ہیں جو ہر وقت ہماری نگاہوں کے سامنے رہا کرتی ہیں۔

انسانی زندگی اور اس کی فلاح کے اس عظیم تقاضے کو اسلام نے جس اہمیت کے ساتھ بنایا ہے وہ قرآن کریم اور حدیث نبوی سے پوری طرح ظاہر ہوتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے: "اُنصُرْ اَخَاکَ ظَالِماً اَوْ مَظْلُوماً" تم ہر حال میں اپنے بھائی کی امداد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم نے خدمت رسولؐ میں عرض کی یا رسولؐ اللہ اگر وہ شخص مظلوم ہو تو ضرور اس کی مدد کی جاسکتی ہے لیکن اگر وہ ظالم ہو تو پھر اس کی مدد کیونکر کی جائے! آپ نے فرمایا کہ وہ اس طرح کہ اس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے یعنی یہ بھی تعاون کی ایک صورت ہے کہ کسی بے رحم انسان کو ظلم کرنے سے باز رکھا جائے تاکہ اس ظلم کے خوفناک نتیجوں سے دوسرے بھی محفوظ رہیں اور خود وہ ظلم کرنے والا بھی۔ بلاشبہ یہ بھی اس کی مدد ہوگی کہ اس کا کردار سدھر جائے اور یہ بھی باہمی تعاون کی ایک قسم ہے۔

آپس کی امداد کے فطری تقاضے کی اہمیت کو رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس مثال سے بھی واضح فرمایا ہے کہ ہمارے تمام افراد کی مجموعی زندگی اور ہمارا پورا معاشرہ ایسا ہے جیسے خود ایک آدمی ہو۔ اس کے جسم میں بہت سے اعضا ہیں لیکن اگر کبھی اُن میں سے کسی ایک عُضو میں درد پیدا ہو جاتا ہے تو سارا بدن دکھنے لگتا ہے اور ہر عُضو اس تکلیف کو محسوس

کرنے لگتا ہے بس یہی حالت ہمارے معاشرہ کی بھی ہے۔ اس کے بھی اعضاء ہیں اور وہ ہیں اس کے افراد۔ اس لئے جب اس کے کسی فرد پر مصیبت پڑے اور وہ کسی درد اور تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو اس درد اور تکلیف کا احساس پورے معاشرہ کے ہر ہر فرد کو ہونا چاہیئے یہاں تک کہ وہ صرف ایک فرد کا درد نہ رہے بلکہ پورے معاشرہ اور پوری قوم کا درد بن جائے اور جس طرح جسم کے ایک عضو کی تکلیف کو دور کرنے میں اس کے سارے اعضاء آپس میں بھرپور تعاون کرتے ہیں اور پوری یک جہتی کے ساتھ امداد اور خدمت کا فرض ادا کرتے ہیں اسی طرح ہم بھی کریں اور ہم میں سے بھی ہر فرد کو اپنے دوسرے بھائی کی تکلیف اور مصیبت کا پورا احساس ہونا چاہیئے اور اسے دور کرنے میں ہیں وہی کوشش کرنا چاہیئے جو اپنی ذاتی تکلیف کو دور کرنے میں کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے :۔ سرور کائنات نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں اپنے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال دیں اور فرمایا دیکھو! اس طرح ایک حصہ سے دوسرا حصہ مل کر مضبوط ہو جاتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم نے دیکھا ہو گا کہ

ایک پتھر سے دوسرا پتھر جب ملتا ہے تو دیوار بن جاتی ہے اور کئی دیواریں مل کر ایک ناقابل تسخیر قلعہ بن جاتی ہیں۔ اسی طرح اگر تم بھی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون رکھو گے اور باہمی اتحاد واخوت کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرو گے تو تم بھی کبھی کمزور نہیں بن سکتے اور دنیا کی کوئی طاقت تمہیں کبھی تسخیر نہیں کر سکتی۔ مسند احمدؒ کی ایک حدیث ہے سرور دو عالمؐ نے فرمایا:۔ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک سچا مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ دوسرے لوگوں کے لیئے بھی وہی نیک اور اچھی باتیں پسند نہ کرے جن کو وہ خود اپنی ذات کے لیئے پسند کرتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے یعنی جس طرح ہر شخص اپنی ذات کے لیئے کبھی کسی برائی اور تکلیف کو گوارا نہیں کرتا اور اسے دور کرنے کی ہمیشہ بھرپور کوشش میں لگا رہتا ہے بس اسی طرح اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے بھائی کے لیئے بھی کبھی کسی مصیبت اور برائی کو گوارا نہ کرے اور اس سے اس کی تکلیف اور پریشانی کو دور کرنے میں پورا تعاون کرے۔ یہ جذبہ اور ولولہ ہر سچے مسلمان میں پایا جانا چاہیئے ورنہ وہ کبھی حقیقی اور سچا مسلمان نہیں

ہو سکتا۔

سچے مسلمان کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کے دل میں دوسروں کے لیئے رحم ہو اور اپنے بھائیوں کی مدد کرنے کا جذبہ پایا جائے، اُس میں ایثار اور قربانی کا ولولہ ہو اور دوسرے انسانی افراد کی تکلیف اور مصیبت کا احساس موجود ہو اور اُس کی نیت خود غرضی، حرص و ہوس اور ذاتی خواہشات سے پاک و صاف ہو۔

باہمی تعاون سے قوموں کی تقدیریں بنتی ہیں اور اسی میں ان کی زندگی، طاقت، آزادی اور عزت کا راز چھپا ہوا ہے۔ جو قومیں آپس میں تعاون نہیں کرتیں وہ ہر بلندی اور ہر عزت سے محروم ہو کر ہمیشہ کے لیئے فنا ہو جاتی ہیں۔

خوش کلامی

سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے " اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ " حقیقی مسلمان وہی شخص ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں ۔ علّامہ نسائی نے اس کو اس طرح بھی روایت کیا ہے ۔ " اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ " حضورؐ نے فرمایا کہ حقیقی مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں ۔

حضورِ انورؐ ایک روز جنّت کا ذکر فرما رہے تھے اصحابِ کرام رضوانُ اللہ علیہم میں سے کسی نے عرض کی یا رسولؐ اللہ ! جنّت کس کو ملے گی ؟ تو آپ نے فرمایا کہ جس مسلمان کا طریقۂ گفتگو بھلا ہو ، جو بھوکوں کو کھانا کھلاتے ، اکثر روزے رکھتا ہو اور رات میں

ایسے وقت نمازیں پڑھے جب دنیا سوتی ہو۔ ایک اور حدیث میں سرکار دو عالم نے فرمایا ہے کہ اچھی اور نیک بات کہنا صدقہ ہے یعنی جس طرح صدقہ دینے سے کسی ضرورتمند اور محتاج کی امداد ہوتی ہے اسی طرح میٹھی زبان سے اُس کی تسلی بھی ہوتی ہے اور اُس کے زخموں کا علاج بھی ہو سکتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے حضورؐ انور سے دریافت کیا کہ میرے لیے کونسی چیز سب سے زیادہ خطرناک ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ تمہاری زبان ہے۔ ان تمام حدیثوں کا حاصل یہ ہے کہ انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی تمام پہلوؤں میں طرزِ کلام اور اندازِ گفتگو کو بڑا دخل اور بے حد اہمیت حاصل ہے اور یہی وہ معیار اور آئینہ ہے جس میں انسان کی شخصیت، قابلیت، سیرت و کردار، تہذیب و تربیت، اخلاق و عادات، کیفیات و جذبات، نقص و کمال اور عیب و ہنر کی پوری پوری عکاسی ہوا کرتی ہے اور اس کی شخصیت کے چھپے ہوئے نقوش ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

امیرالمؤمنین حضرت علیؑ نے فرمایا ہے: "اَلْمَرْءُ مَخْبُوْءٌ تَحْتَ لِسَانِہٖ" انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ ہر شخص کی اصلی شخصیت کا صحیح اندازہ اس کی گفتگو ہی سے ہو جاتا ہے اور اُس کی وہ کمزوریاں اور خوبیاں جو پردۂ خفا میں ہوتی ہیں اس کی زبان انھیں ظاہر کر دیا کرتی ہے۔ اس بیان کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ فحش کلامی اور غیر مناسب اور غیر شائستہ گفتگو کرنے والے انسان کو اسلامی تہذیب اور اسلامی تعلیم و تربیت سے دور کا بھی علاقہ اور واسطہ نہیں ہوتا۔ امام ابوجعفر محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ اللہ اس شخص کا دشمن ہے جو بدزبان ہو، زبان دراز ہو، سبّ و شتم اور فحش کلامی کرنے والا ہو۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے۔ لوگوں سے تم بھی اُسی بہترین انداز پر کلام کیا کرو جس طرح تم خود چاہتے ہو کہ لوگ تم سے اچھے طریقہ پر گفتگو کریں اور اپنی زبانوں کو فحش کلامی اور بُرے طرزِ گفتگو سے محفوظ رکھو۔ غرض اسلام نے مسلمانوں کو اس کی تعلیم دی ہے کہ وہ جس سے بھی گفتگو کریں ایسے

انداز سے کریں جو انتہائی بھلا ہو اور پسندیدہ ہو۔ اللہ نے سورۂ بقرہ[۸۳] میں فرمایا ہے: وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا، لوگوں سے اچھے طریقہ پر گفتگو کیا کرو۔ اِس فرمانِ خداوندی کی وسعت میں گفتگو کے تمام پہلو موجود ہیں یعنی یہ کہ جس شخص سے کلام کیا جائے اُس کی عزت و شخصیت اور مقام و مرتبہ کا خیال رکھا جائے، جو بات کہی جائے وہ سچائی، حقیقت اور خلوص پر مبنی ہو، اس میں بناوٹ نہ ہو، خوشامد نہ ہو، فریب نہ ہو، اور جھوٹ نہ ہو اور ایسے طریقہ پر نہ ہو کہ سننے والوں کو بُرا لگے اور ان کے دلوں کو تکلیف پہنچے بلکہ اس انداز سے ہو کہ بگڑے ہوئے تعلقات خوشگوار ہو سکیں، الجھے ہوئے امور سلجھ سکیں اور گھٹی ہوئی محبت و الفت بڑھ سکے۔ ایسا نہ ہو کہ محبت و اُخوت کے رہے سہے رشتے بھی ٹوٹ جائیں اور دوستی اور خلوص میں اضافہ ہونے کے بجائے آپس میں عداوت اور دشمنی پیدا ہو جائے یا اس میں اضافہ ہو جائے۔ بلاشبہہ کلام میں بڑی تاثیر ہوا کرتی ہے۔ یہ خوش بھی کر سکتا ہے اور غمگین بھی بنا سکتا ہے

ہنسا بھی سکتا ہے، رُلا بھی سکتا ہے، یہ دیوانوں کو ہوش میں بھی لا سکتا ہے۔ یہ ہلاک بھی کر سکتا ہے اور دم توڑنے والوں کو زندگی بھی دے سکتا ہے۔ اسی لیئے قرآن و حدیث میں اس کی تاکید کی گئی ہے کہ مسلمان سخت کلامی اور دل آزار طرزِ گفتگو سے پرہیز کیا کریں اور اس طرح بات نہ کریں کہ سننے والوں کو اس سے رنج پہنچے اور بجائے محبت پیدا ہونے کے آپس میں دشمنی، اختلافات، غلط فہمی اور منافقت پیدا ہو۔ اللہ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو حکم دیا تھا کہ فرعون جیسے کافر و مشرک سے بھی کلام کریں تو انتہائی حسن اور نرمی کے ساتھ کریں۔ سورہ طٰہٰ میں اللہ نے فرمایا ہے "فَقُولَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى" یعنی اے موسیٰ و ہارونؑ جب تم فرعون کے پاس تبلیغ کے لیے جاؤ تو اس سے انتہائی نرمی کے ساتھ بات کرنا تاکہ وہ تمہاری نصیحت مان لے یا ڈر ہی جائے۔ اس فرمان الٰہی سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ نبیؐ سے لیکر ایک عام مسلمان تک سب ہی کے لیئے اسلام نے نرم گفتاری اور حسنِ کلام کو ضروری قرار دیا ہے۔

دیانتداری

دیانتداری سے مراد ہے معاملات میں سچائی، امانت، اور پوری ایمانداری سے کام لینا۔ اس سلسلہ میں تمام وہ معاملات جن کا انسانی زندگی سے تعلق ہے دو حیثیتیں رکھتے ہیں کچھ تو وہ ہیں جن کا تعلق اللہ کی ذات اقدس سے ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا تعلق اللہ کے بندوں سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ ان دونوں حیثیتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ جن معاملات کا تعلق ہمارے اللہ سے ہے ان میں تو ہم سچائی اور دیانت پر بہر حال عمل کریں گے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ ہماری یہ دیانت اُس وقت تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی جب تک ہم اس کے دوسرے رخ کو بھی مکمل نہ کر لیں یعنی اُن باتوں میں بھی پوری دیانت سے کام نہ لیں جن کا تعلق عباد اللہ سے ہے۔ اس دیانتداری میں مسلمان کی زندگی

کا ہر رُخ اور ہر شُعبہ شامل ہے، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، سماجی ہو یا سیاسی، اقتصادی اور تجارتی ہو یا علمی و فنّی اور ثقافتی - غرض اسلام کے نزدیک سچا مسلمان وہی ہے جس کے قول و عمل اور ظاہر و باطن کسی رخ میں کبھی بددیانتی کا شائبہ تک موجود نہ ہو - اس تفصیل سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ دیانت داری کا رشتہ صرف مالی اور کاروباری معاملات ہی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ مسلمان کی زندگی کے ہر شُعبہ سے ہے - ایک امین کی دیانتداری یہ ہے کہ وہ امانت میں خیانت نہ کرے - ایک ملازم کی دیانتداری یہ ہے کہ جو وقت وہ فروخت کر چکا ہے اور جو فرائض قبول کر چکا ہے ان میں بددیانتی نہ کرے - ایک معلّم اور حاکم اور مالک کی دیانتداری یہ ہے کہ وہ اپنے زیردست افراد کی حق تلفی نہ کرے اور ان کی خدمت میں کوتاہی کا مرتکب نہ ہو - اسی طرح ایک محکوم اور ماتحت فرد کی دیانتداری یہ ہو گی کہ وہ اپنے متعلقہ فرائض کو پوری طرح انجام دے -

قرآن پاک نے بڑی صراحت اور وضاحت سے ہمیں بتایا ہے کہ ہم کبھی دیانت کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیں - سورۂ نسآء/۵۸

میں اللہ کا فرمان ہے (ترجمہ) یقیناً اللہ تم کو اس کا حکم دیتا ہے کہ تم امانتوں کو اُن کے حقداروں تک پہنچا دو۔ "امانات" یعنی "امانتیں" ایک ایسا جامع لفظ ہے جس میں وہ تمام ذمہ داریاں بھی آجاتی ہیں جو امانت کی حیثیت رکھتی ہوں۔ الٰہی سورۂ نساء آیت ۱۳۵ میں دوسری جگہ پر ارشاد ہوا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اے اہلِ ایمان تم عدل و انصاف پہ ہمیشہ قائم رہو۔ ظاہر ہے کہ یہ بات تو اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان میں بد دیانتی نہ ہو۔

سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ایک حدیث میں فرمایا ہے "لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ" یعنی جو شخص بد دیانتی کرتا ہے درحقیقت اس میں ایمان کا وجود ہی نہیں ہے۔ بلاشبہ دیانتداری ایمان کی سب سے بڑی بنیاد ہے اور ایک سچے مسلمان کے حقیقی اسلام و ایمان کا نشان ہے۔

قول و قرار کی پابندی

عہد و قرار کی پابندی پر بڑی حد تک انسانی بلندی اور انسانی معاشرہ کی بھلائی موقوف ہے۔ اسلام نے بڑی شدت کے ساتھ اس کا ہر مسلمان کو حکم دیا ہے۔ اس لئے ایک سچے مسلمان کی یہی شان ہونی چاہیئے کہ وہ جب بھی کسی سے وعدہ کرلے تو اس کو ہر حال میں پورا کرے یعنی پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہو تو ہٹ جائے مگر مسلمان جو زبان سے وعدہ کرلے اس میں فرق نہ آنے پائے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ پاک وفائے عہد کا ایک مکمل نمونہ تھی۔ آپ کے سخت ترین دشمن بھی اس بات کو مانتے تھے کہ آپ سے بڑھ کر کوئی دوسرا ایفائے عہد نہیں کرسکتا۔ آپ نے جب کبھی کسی سے کوئی وعدہ کیا تو اسے ہمیشہ پورا کیا اور کبھی اس میں فرق نہ آنے دیا۔ چنانچہ جب شہنشاہِ روم نے حضورؐ کے ایک سخت ترین دشمن سے دریافت کیا تھا کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کبھی عہد و قرار کی خلاف ورزی تو نہیں کرتے ؟ تو اُس نے باوجود دشمن ہونے کے یہ جواب دیا تھا کہ انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا اور وہ بڑے امین ہیں اور ہمیشہ اپنے عہد اور وعدہ کو پورا کرتے ہیں۔

صفوانؓ بن اُمیہ اسلام لانے سے قبل حضورؐ کے بڑے مخالف اور آپ کی دشمنی میں بے حد سرگرم تھے۔ جب ۸ھ میں مکہ فتح ہوگیا تو صفوانؓ جان بچا کر یمن کے ارادے سے جدہ چلے گئے۔ ایک صحابی نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی کہ صفوانؓ خوف کی وجہ سے فرار ہو گئے ہیں۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ " انھیں ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے میں نے انھیں امان دیدی پھر اپنا عمامہ مبارک صحابی کو عطا کیا اور فرمایا کہ یہ اس کی نشانی ہے کہ میں نے انھیں امان دی ہے۔ آخر صفوانؓ خدمت اقدس میں حاضر ہو گئے چونکہ وہ جانتے تھے کہ حضورؐ کبھی وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور حاضر ہو کر اسلام سے مشرف ہوئے۔ (سیرت النبیؐ ج ۲ صفحہ ۳۶۳ ، سیرت لابن ہشام ج ۲ صفحہ ۲۴)

حذیفہؓ اور آن کے والد حسیلؓ (الیمانؓ) مکہ سے مدینہ آرہے تھے راستہ میں مشرکین نے انھیں یہ سمجھ کر روک لیا کہ وہ آنحضرتؐ کے ساتھ

جہاد میں شرکت کے لیئے جا رہے ہیں۔ آخر انھیں اس شرط پر رہائی ملی کہ وہ جنگ میں حضورؐ کا ساتھ نہ دیں گے۔ یہ دونوں آپ کے پاس حاضر ہوئے اور تمام واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم دونوں واپس جاؤ اور ہر حال میں وعدہ پورا کرو ہمیں صرف اللہ کی مدد درکار ہے۔

حضورؐ انور نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ "قیامت میں مجھ سے زیادہ وہ مؤمن قریب ہوگا جو سب سے زیادہ اپنے وعدہ اور اپنے عہد کو پورا کرتا ہے۔"

اللہ مسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ جب وہ کسی سے عہد و قرار اور وعدہ کرلیں تو اسے وفا کریں اور کبھی اس کی خلاف ورزی نہ کریں۔

عجز و انکسار

عجز و انکسار یا خاکساری اور فروتنی انسان کی وہ اعلیٰ صفت ہے جو بڑی حد تک اس کو انفرادی اور اجتماعی برائیوں سے بچا لیتی ہے اور اس طرح تکبّر و غرور سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں عجز و انکسار کی صفت ان سب کی یکسر نفی کر دیتی ہے۔

اِس صفتِ عجز و انکسار سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان اپنے قول و عمل سے احساسِ کمتری اور ذلّت و عاجزی اور پستی و بے چارگی کا مظاہرہ کرے اور دوسروں کے سامنے اور خود اپنی جگہ پر بھی حقارت و ضعف اور مایوسی کا مجسّمہ بنا رہے کہ یہ بات اسلام کی پُرشکوہ و عظمت روح کے قطعاً منافی ہے۔ احساسِ کمتری اور قنوطیّت و مایوسی، انفرادی کامیابیوں اور ترقیوں کی راہیں بند کرتی ہے جبکہ عجز و انکسار کی صفت انسانی

ضمیر کو آگے بڑھنے اور ترقی کی راہ پر گامزن رہنے کی دعوت پیہم دیتی رہتی ہے اور اس طرح انسان کسی وقت بھی اپنی ذات اور صفات کے متعلق کسی غلط فہمی کا شکار نہیں بن سکتا اور وہ قدم پر علم و عمل اور حسنِ سیرت و اخلاق کی لامحدود فضاؤں میں ابھرتے رہنے کی سعی مسلسل میں لگا رہتا ہے۔

عجز و انکسار اور فروتنی اور خاکساری اصل میں وہی قابل تعریف ہو سکتی ہے جس میں نمائش اور ریاکاری کا شائبہ تک موجود نہ ہو یعنی یہ نہ ہو کہ انکسار اور خاکساری کسی مخصوص مفاد کے حصول کے لیئے ہو اور اس طرح اس اعلیٰ صفت کو فریب دینے کا وسیلہ اور ذریعہ بنا کر اپنی اغراض پوری کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایسی نمائشی خاکساری اور ایسی ریاکارانہ فروتنی کسی حال میں بھی قابل تعریف نہیں ہو سکتی بلکہ یہ منافقت اور مکاری ہے اور انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے پوری طرح قابلِ مذمت اور لائقِ نفرت و حقارت ہے۔

مشہور کہاوت ہے کہ میوہ دار ڈالیاں ہمیشہ جھکی

رہا کرتی ہیں۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جو لوگ صحیح معنی میں صاحبِ کمالات ہوتے ہیں وہ کبھی غرور و تکبر نہیں کرتے اور دوسروں کے سامنے اپنے حسنِ اخلاق اور عجز و فروتنی کا ثبوت اپنے قول و عمل دونوں ہی سے دیتے رہتے ہیں۔

جس شخص کے مزاج میں انکسار و تواضع اور عجز و فروتنی کا جذبہ موجود ہوگا اس سے کبھی کسی کے ساتھ جھگڑا نہیں ہوسکتا اور وہ کبھی کسی پر ظلم اور ناانصافی کا ارتکاب نہیں کرسکتا۔ پھر اگر یہ جذبہ معاشرے کے تمام افراد میں پیدا ہوجائے تو اُس پورے معاشرے سے ظلم، حق تلفی اور ناانصافی کا نام و نشان تک مٹ جائے گا اور سب لوگ میل، محبت، اتفاق و اتحاد، عزت و آبرو، امن و امان اور عدل و انصاف کی فضا میں سانس لیتے رہیں گے۔

اسلام انسانی نسل کو امن و سلامتی کا پیغام دیتا ہے اور اس کی بنیادی غرض یہ ہے کہ سب لوگ امن و سکون کے ماحول میں زندگی بسر کریں اور دوسروں کو بھی زندگی بسر کرنے دیں اسی لیئے اُسکی تمامتر تعلیمات اسی اہم ترین مقصد کے حصول کی راہ ہموار کرتی ہیں اور اسکی

بنیادوں کو استحکام عطا کرتی ہیں تاکہ نسلِ آدمؑ انتہائی خوشگوار ماحول اور بے حد پُرسکون فضا میں اپنے اُس بلند مَقام کے حصول کی کوشش اور اُس حقیقی غرض کو پورا کرنے کی سعی کر سکے جس کے لیئے کائنات کے پیدا کرنے والے نے اُس کی تخلیق کی ہے۔ اس غرضِ تخلیق کو پورا کرنے کے لیئے جو بنیادی چیزیں ہیں اُن میں سے ایک اہم چیز وہی ہے جس پر اس وقت گفتگو کی جا رہی ہے یعنی انکسار و فروتنی کا صحیح جذبہ اور صحیح مَظہر۔ اسلام کی سب سے بڑی دستاویز اللہ کی کتاب، انسان کو اس عظیم صفت کی طرف بار بار دعوت دیتی ہے تو کبھی حضرت خاتم المرسلینؐ کی مبارک و مقدس حدیثیں اُس کو انکسار کا سبق دیتی ہیں اور یہ تعلیم صرف نظریاتی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ سَرورِ دو عالمؐ کی حیاتِ طیبّہ اور آپ کے اہلِ بیتِ کِرام اور صحابۂ اخیارؓ کی زندگیاں بھی ہمارے سامنے موجود ہیں جو عملی زندگی میں ہماری رہبری کے لیئے پوری طرح کافی ہیں۔

قرآنِ حکیم میں اللہ نے حضرت لقمانؑ کی نصیحتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے یہ نصیحتیں انہوں نے اپنے

بیٹے کے لیئے کی تھیں مگر ان کا حقیقی خطاب پوری انسانیت کی طرف ہے اور اسی لیئے اللہ نے ان کا ذکر اپنی اُس آخری کتاب میں کیا ہے جس کی تمام تر تعلیمات مکان و زمان اور وقت و تاریخ کی حدوں کی پابند نہیں ہیں بلکہ آفاقی اور عالمی ہیں اور قیامت تک ہر دور کے لیئے ہیں۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ط إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ه وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ط إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ (لقمان ۱۸/۱۹)

اور لوگوں سے بے رخی نہ کیا کرو اور زمین پر اتر اکر نہ چلنا کیونکہ کسی اترانے والے شیخی خورے کو اللہ پسند نہیں کرتا اور اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کرو اور جب کسی سے بات کرو تو اپنی آواز دھیمی رکھا کرو کیونکہ سب سے زیادہ مکروہ بڑی آواز تو گدھوں کی ہوتی ہے"۔ اس نصیحت قرآنی میں انسان کے قول و فعل اور چال ڈھال ہر چیز پر پوری طرح نظر رکھی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک سچے مؤمن کی شان یہی ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے خیالات و افکار اور اعمال و اقوال میں سے کسی ایک چیز میں بھی غرور و

خود بینی کا شائبہ تک نہ آنے دے۔ نہ گفتگو میں جارحیت اور شدت ہو، نہ لہجہ میں بے اعتدالی اور سختی ہو اور نہ عمل سے کسی کو تکلیف پہنچنے کا امکان ہو اور آپس میں ایک مسلمان کے تعلقات دوسرے مسلمان سے اسی طرح کے ہوں جیسے دو سچے محبّت کرنے والے سگے بھائیوں میں ہوا کرتے ہیں۔

پھر یہاں تو اسلام کی بھی شرط نہیں ہے بلکہ یہ نصیحت غیر محدود ہے یعنی جب ایک مسلمان کسی دوسرے انسان سے کوئی برتاؤ کرے تو وہ انتہائی معتدل اور شریفانہ ہو چاہے وہ دوسرا شخص کسی بھی ملک، قوم مذہب، نسل، رنگ، زبان اور خطّے سے تعلق رکھتا ہو۔ بلاشبہ خالص اور حقیقی اسلامی تہذیب جن عناصر سے ظہور میں آتی ہے ان میں سے ایک اہم عنصر آپس کا محبّت سے بھرا ہوا شریفانہ برتاؤ اور عجز و انکسار ہے جس کی نفی کرتے ہوئے کوئی شخص بھی اسلام کے صحیح معیار پر اترنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

سورۂ فرقان (آیۃ ۶۳) میں فرمایا گیا ہے جس کا ترجمہ

یہ ہے "خدائے رحمان کے خاص بندے وہی ہیں جو زمین پر عجز و انکسار سے چلتے ہیں اور جب جہالت والے لوگ ان بندگانِ خدا سے غلط طور پر خطاب کرنے لگتے ہیں تو وہ اُن سے حسن کے ساتھ کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں یعنی اُن کو اپنے مُنہ نہیں لگاتے۔

خود سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو اللہ نے حکم دیا ہے "وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (حجر ۸۸) (اے رسولؐ) اہلِ ایمان کے لیئے تم اپنا بازو ہمیشہ جھکائے رہو" اس کا مطلب یہی ہے کہ کبھی تم لوگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرنا جو تواضع، فروتنی اور عجز و انکسار کے منافی ہو اور ہمیشہ تمہارا برتاؤ ان کے ساتھ انتہائی حُسنِ خُلق کے ساتھ ہونا چاہیئے۔

خود حضورؐ انور عجز و انکسار کا ایک عدیم المثال نمونہ تھے اور اسی بنا پر آپ کا بڑے سے بڑا دشمن بھی اگر کبھی ایک مرتبہ بھی آپ کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کر لیتا تھا تو پھر وہ ہمیشہ کے لیئے آپ کی عقیدت و محبت کا اسیر ہو جاتا تھا۔ ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے

فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تم سب لوگ خاکساری اختیار کرو تاکہ پھر کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر و غرور نہ کرے"۔

ہر معاشرہ میں تمام افراد ایک حالت میں نہیں ہوا کرتے۔ پھر اگر کوئی مصیبت میں زندگی گذار رہا ہو تو اس کا دل یوں ہی ٹوٹا ہوا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی دوسرا آدمی جو پہلے شخص کی بہ نسبت اچھی حالت میں ہے اس مصیبت زدہ سے بے رخی اور بد اخلاقی کا برتاؤ کرے تو اسے کتنی تکلیف ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر بہتر حالت والا آدمی اپنے دکھی بھائی سے پیار و محبت اور انکسار و فروتنی اور حسنِ اخلاق کے ساتھ برتاؤ کرے گا تو اس کے دل کو کیسی راحت حاصل ہو سکتی ہے!

نتیجہ میں اس اعلیٰ صفت کی وجہ سے معاشرہ سے جھگڑے، فساد، انتقام، بد نظمی، بدامنی، افراتفری اور اسی طرح کے تمام تخریبی حالات اور عناصر ہمیشہ

کے لیئے ختم ہوسکتے ہیں۔

اللہ تعالے ہم سب مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ اپنی زبان، دل اور عمل سے باہمی حسنِ خلق، حسنِ معاشرت اور فروتنی وخاکساری اور عجز و انکسار کا انتہائی مخلصانہ ثبوت دیتے رہیں اور بحیثیت ایک سچے مسلمان کے اپنی اخلاقی و دینی ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس کرتے رہیں۔

دوسروں کی اِمداد

دوسروں کی امداد کا مطلب باہمی تعاون اور باہمی امداد ہے، جس کی طرف اسلام نے پوری شدت کے ساتھ لوگوں کو توجہ دلائی ہے اور یہاں تک کہدیا گیا ہے کہ کوئی شخص اُس وقت تک پورا مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اور لوگوں کے لیئے وہی پسند نہ کرے جو وہ خود اپنے لیئے پسند کرتا ہے (مُسند احمدؒ ج ۴)

ظاہر ہے کہ ہر آدمی چاہتا ہے کہ دوسرے اُس کی مدد کریں اس لیئے اس کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ دوسروں کی امداد کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔ اس جذبۂ خدمت اور اس شعورِ امداد کو اسلام کسی شخص کے سچے مؤمن ہونے کی علامت قرار دیتا ہے۔ (سورۂ حُجُرات ۱/)

خدا کا ارشاد ہے: "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" تمام ایماندار لوگ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ یہ بھی "باہمی امداد" کی تعلیم کا ایک واضح رخ ہے کیونکہ اخوت اور برادری اگر موجود ہے اور آپس میں ہر ایک کے دل میں اُس کا شعور پایا جاتا ہے تو باہمی تعاون اس

کے ساتھ لازمی ہوگا ورنہ پھر اخوّت کے کوئی معنی باقی نہیں رہ سکتے۔
سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اپنی ایک حدیث میں فرماتے
ہیں کہ تمام مسلمان مل کر ایک آدمی کی طرح ہیں کہ اگر اس کی
آنکھ دکھتی ہے تو اُس کا سارا بدن دکھ محسوس کرنے لگتا ہے اور اگر
اس کے سر میں درد ہوتا ہے تو اس کا پورا جسم تکلیف کا احساس
کرتا ہے (صحیح مسلم) اس کا مطلب یہ ہوا کہ ساری ملّت مسلم ایک
بدن اور ایک جسم کی حیثیت رکھتی ہے اور ملّت کے تمام افراد اُس
کے اعضاء ہیں تو پھر جس طرح بدن کے ایک جزو کی تکلیف اور درد
سے سارا بدن دکھ اور تکلیف کا احساس کرنے لگتا ہے اسی طرح
چاہیئے کہ اگر ایک مسلمان کو کوئی تکلیف ہو تو ساری ملّتِ مُسلمہ
اُس درد کا احساس کرے اور اُس مسلمان کے دکھ میں شریک ہو
جائے اور اُسے دور کرنے کی کوشش میں اُس فرد کا ساتھ دے
بالکل اُسی طرح جیسے ایک عُضو کے دکھ کو دور کرنے میں پورے
اعضائے بدن شریک ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسری میں
رسُول کریم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان باہم ایک دوسرے سے
مل کر اس طرح مضبوط ہو جاتے ہیں جیسے دیوار ہو کہ اُس کا ایک
حصّہ دوسرے حصّہ سے مل کر استحکام حاصل کرتا ہے۔ یہ فرما کر

آپ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا کہ انگلیاں باہم مل کر کس طرح مضبوطی اور قوت حاصل کرتی ہیں اس کا حاصل یہ ہوا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل جل کر مستحکم بن جاتی ہے اور آخر میں ایک ناقابل تسخیر قلعہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ہاتھوں کی انگلیاں باہم ملکر مضبوط ہو جاتی ہیں اسی طرح ملت مسلمہ کی بقاء، ترقی اور استحکام صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہر مسلمان اپنے دوسرے بھائی کی مدد کرے کیونکہ بغیر باہمی امداد اور تعاون کے نہ کوئی فرد باقی رہ سکتا ہے اور نہ ترقی کر سکتا ہے اور نہ کوئی معاشرہ اور جماعت یا قوم اور ملک، غرض ایک دوسرے کی مدد کرنے ہی سے ہر ایک کی بقاء اور زندگی وابستہ ہے۔ اقتصادی، سماجی، علمی، معاشی اور دفاعی میدانوں میں یا زندگی کے دوسرے مرحلوں پر بغیر اس باہمی امداد اور آپس کی اعانت کے، انسان ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اُس کی ترقی اور بقاء کا راز اسی میں ہے کہ ہر ایک دوسرے کی تکلیف کا احساس کرے اور اس کی مدد کرے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی بھی کسی کی مدد نہ کرے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر نہ کوئی زندہ رہے گا اور نہ کسی قسم کی ترقی حاصل کر سکے گا۔ سڑکوں پر

جھاڑو دینے والوں، دفتروں کی میز، کرسیاں صاف کرنے والوں
دیہاتوں کی سنسان آبادیوں میں کھیتی باڑی کرنے والوں اور
ملک کے دفاعی میدانوں تک ہر معاشرہ اور ہر طبقہ کا وجود، استحکام
اور اس کی خوشحالی صرف اسی بات پر موقوف ہے کہ ایک دوسرے
کی مدد کرے۔ یہ بات قطعی طور پر غلط بھی ہے اور نا قابل عمل بھی
کہ ایک فرد یا ایک جماعت کی امداد دوسرے سب لوگ کرتے رہیں
اور وہ دوسروں کی امداد نہ کرے، یقیناً کسی بھی فرد کو یا گروہ
کو دوسروں کی مدد لینے کا استحقاق اسی وقت ہو سکتا ہے جب
وہ خود بھی دوسروں کے آڑے وقت کا احساس کرے اور اُن کا
شریک حال بنے کیونکہ یہ دنیا باہمی تعاون اور باہمی اشتراکِ
عمل اور آپس کی محبت اور امداد ہی پر قائم ہے۔ پیغمبر مدنی صلیٰ
اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہجرت کے بعد پہلی فرصت میں ایک
ایمانی اور اسلامی اخوت اور برادری کو عملی شکل عطا فرمائی تھی
اور مدینہ کے مقامی مسلمانوں کے ساتھ مکہ کے مہاجر مسلمانوں
کے برادرانہ رشتے قائم کر دیئے تھے۔ یہ اسی وجہ سے کہ ایک دوسرے
کو اپنا بھائی سمجھے اور خود غرضی کا جذبہ فنا ہو جائے اور آپس میں
ایک دوسرے کی اس طرح مدد کرے جیسے ایک سگا بھائی اپنے

دوسرے بھائی کی مدد کرنا اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتا ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے۔ سرورِ انبیاء نے فرمایا: جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف بھی دور کر دیگا تو خدا قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور فرما دیگا۔ اور جو کسی مفلس اور غریب کیلئے آسانی مہیا کرے گا تو خدا دنیا اور آخرت میں اس کے لیئے آسانیاں عطا فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا تو خدا دنیا و آخرت میں اس کا بھی پردہ رکھے گا اور خدا اپنے بندے کی مدد فرماتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے (سنن ابو داؤد) جریرؓ بن عبد اللہ بجلیؓ مشہور صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے سرورِ دو عالم سے تین باتوں پر بیعت کی تھی، نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا، اور ہر مسلمان کی خیر خواہی اور مدد کرنا (بخاری) اِن ہی باتوں پر مجموعی نظر رکھتے ہوئے قرآن مجید کا مشہور فرمان ہے۔ "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" (آل عمران ۱۰۳) الٰہی رشتہ کو مضبوط تھامے رہو اور منتشر اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ۔ یہ کس بات کی تعلیم تھی؟ یہ اسی امر کو بتایا گیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں اور زندگی کے ہر مرحلہ میں باہمی تعاون کے ساتھ بسر کریں کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو یہ ہماری

اجتماعی اور انفرادی دونوں طرح کی موت ہوگی۔ زندگی، طاقت، خوشحالی اور ترقی صرف اسی میں ہے کہ ہم میں اجتماعی زندگی کی قدروں کا شعور پیدا ہو اور ہم ایک دوسرے کی مدد کریں۔ سرورِ کائنات اپنے ایک ارشاد میں فرماتے ہیں: اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِماً اَوْ مَظْلُوْماً۔ تم اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ یہ تمہارا فرض ہے کہ تم اس کی ہر صورت میں نصرت اور مدد کرو۔ صحابہؓ کرام نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اگر وہ شخص مظلوم ہے تو اس کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر ظالم کی امداد کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ نے فرمایا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کے ہاتھوں کو ظلم کرنے سے روکو تاکہ وہ اس گناہ اور برائی سے محفوظ رہ سکے اور آئندہ دوسروں پر ظلم کرنے سے باز آجائے۔

بلاشبہ اسلام نے باہمی امداد کے مسئلہ پر بڑا زور دیا ہے کیونکہ یہی وہ اہم ترین بنیاد ہے جس پر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ترقی اور خوشحالی منحصر ہے مگر اسی کے ساتھ اس "تعاوُن" کے ایک انتہائی خطرناک پہلو سے بھی لوگوں کو آگاہ کر دیا گیا ہے اور وہ ہے یہ قرآنی اعلان (سورۃ مائدہ ۵/۲): وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" یعنی نیکی اور پرہیزگاری کے

کاموں میں تو ایک دوسرے کی ضرور مدد کیا کرو مگر گناہ اور سرکشی اور زیادتی کی باتوں میں ایک دوسرے کی مدد ہرگز نہ کرنا۔ اس لیئے یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ اسلام جس قسم کا تعاون چاہتا ہے وہ وہی ہے جس میں حق اور انصاف، نیکی اور صلاح، تعمیر اور ترقی، امن اور سلامتی کی قدریں محفوظ رہیں۔ لیکن اگر یہی امداد اور تعاون ظلم اور زیادتی کے لیئے ہو، تخریب اور انتشار کے لیے ہو۔ بدامنی اور قانون شکنی کے لیئے ہو، اپنے غلط ذاتی مقاصد کی تحصیل کے لیئے ہو، خواہ اس کے نتیجہ میں دوسروں کو کیسی ہی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑے۔ تو اس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دے سکتا، بہر حال ناجائز اور غلط اغراض خواہ وہ کسی روپ میں ہوں اور کسی شکل میں ہوں ان میں باہمی تعاون اور امداد کرنا اسی طرح اسلام کے نزدیک سنگین جرم ہے جس طرح اس قسم کے اغراض خود جرم اور گناہ ہیں۔ یہ باہمی امداد کا نظریہ مختلف جہتوں سے مختلف قسم کی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ جس قدر مقصد کی اہمیت اور اس کا جواز بڑھتا جائیگا تعاون کی ضرورت اور اہمیت میں بھی اضافہ ہونا ضروری ہے انفرادی ضرورتوں میں بھی تعاون لازمی ہے لیکن جب ضرورت

فرد سے آگے بڑھ کر کسی قوم کی زندگی اور کسی ملک کی خوشحالی سے متعلق ہو تو اس تعاون کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے - آج ہمیں اپنے ملک پاکستان کے لئے خصوصاً اور ساری ملتِ اسلامیہ کے لئے جو دنیا کے کسی خطہ میں بھی آباد ہو عموماً اس تعاون کی شدید ضرورت ہے اگر مسلمان قومیں اِس اسلامی تعلیم پر پوری قوت کے ساتھ عمل کریں تو ان کو تسخیر کرنے اور اُن کو غلام بنانے کا کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا - اور اُن کی ہر شکست اور کمزوری فتحِ مبین اور لازوال استحکام طاقت اور سالمیت میں بدل سکتی ہے -

عَیب جوئی

قرآن حکیم میں اللہ نے فرمایا ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ط (حُجُرات ۱۲) اے اہل ایمان بہت سے گمانوں سے بچو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوا کرتے ہیں اور لوگوں کی ٹوہ میں نہ لگے رہا کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غِیبَت نہ کیا کرے۔

عیب جوئی سے مراد یہی ہے کہ دوسروں کی ٹوہ لگائی جائے، اُن کے عَیب اور برائیوں کو ڈھونڈا جائے اور اُن کی پردہ دری ہو۔ ظاہر ہے کہ اسلام نے قطعی طور پر اس کی اجازت نہیں دی سوائے ایسے حالات اور ایسی صورتوں کے جب کسی کے نجی حالات اور پوشیدہ عادتیں شرعی نقطۂ نظر سے معلوم کرنا جائز یا ضروری ہو جائے اور بغیر معلوم کئے انفرادی یا اجتماعی نقصانات

پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ مثال کے طور پر کوئی شخص کسی کو نوکر رکھنا چاہتا ہے تو اس کے حالات کا پوری طرح علم حاصل ہونا ضروری ہے اسی طرح ازدواجی تعلّقات کے لئے بھی یہ بات بالکل مناسب بلکہ ضروری ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے تمام حالات سے باخبر ہوں تاکہ اُن میں سے کوئی دھوکا نہ کھا سکے۔

لیکن اگر اس قسم کی کوئی صورت نہیں ہے تو پھر عیب جوئی ایک اخلاقی جُرم ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ جیسا کہ اِس آیۂ کریمہ میں اِس کا ذکر ہے۔ اس میں تین قسم کی بُرائیوں سے روکا گیا ہے ایک تو یہ کہ بغیر کامل تحقیق کیئے کسی کی طرف سے بدگمانی نہ کی جائے، دوسرے کسی کا عیب معلوم کرنے کے لئے اُس کی ٹوہ نہ لی جائے اور تیسری یہ بات ہے کہ کوئی کسی کی غِیبَت یعنی پیٹھ پیچھے بُرائی نہ کرے۔

اِس وقت کا موضوعِ بیان اگرچہ عیب جوئی یعنی عیب نکالنا اور ٹوہ لگانا ہے مگر درحقیقت بدگمانی اور غِیبَت بھی اِس موضوع سے بے تعلق نہیں ہے۔ بدگمانی

کا اس سے تعلق سببی ہے اور غیبت اس سے بحیثیت نتیجہ کے مربوط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عیب جوئی کا جذبہ اور خواہش بدگمانی کے سبب ہی سے وجود میں آتی ہے پھر عیب جوئی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی کی پردہ دری کی جائے یعنی اُس کے عیبوں اور پوشیدہ حالات کو دوسروں کے سامنے اچھالا جائے اور شہرت دی جائے کہ یہی غیبت ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ اگر بدگمانی سرے ہی سے موجود نہ ہو تو عیب جوئی اور تجسّس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا اور جب تجسّس اور عیب جوئی کی فکر ہی نہ ہوگی تو پھر غیبت اور بدگوئی کیوں کی جائے گی پھر اس کا دوسرا رخ یہ بھی سامنے آگیا کہ عیب جوئی صرف واحد برائی اور تنہا گناہ نہیں ہے بلکہ مجموعہ ہے تین بدترین گناہوں کا جن میں سے ہر ایک انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے مکمل طور پر تباہ کن ہے۔

اسی کے ساتھ تجسّس اور عیب جوئی کے درمیان تھوڑا سا فرق بھی ہے۔ تجسّس سے مراد یہ ہے کہ آدمی

دوسروں کے خفیہ اور چھپے ہوئے عیبوں کی کھوج لگائے اور
ٹوہ لے جبکہ عیب جوئی اسے کہتے ہیں کہ کسی کی برائیاں
تلاش کرکے اُن کی تشہیر کی جائے اور اُس شخص کی حیثیت
کو لوگوں کی نظر سے گرانے کی سعی کی جائے۔ بہرحال تجسس
اور عیب جوئی تقریباً ملتی جلتی باتیں ہیں اور اُن سے انسانی
معاشرے کو بے انتہا نقصان پہنچ سکتا ہے اگر ان کی
روک تھام نہ کی جائے۔ چونکہ اسلام کی پہلی اور بنیادی
نظر، اخلاقی استحکام پر ہے اور اُس نے سب باتوں سے
زیادہ انسانی کردار کی اصلاح اور تعمیر پر زور دیا ہے اس
لیئے اُسنے عیب جوئی، تجسس، غیبت اور بدگمانی کو روکنے
کے لیئے سخت ترین اقدامات بھی کیئے ہیں تاکہ مسلمان کی
انفرادی زندگی بھی تباہی سے محفوظ رہ سکے اور اُس کی
اجتماعی زندگی بھی فتنہ و فساد اور باہمی انتشار اور افراتفری
سے بچ جائے۔

انفرادی زندگی کی تباہی تو اس طرح کہ جب کوئی
شخص کسی دوسرے کی عیب جوئی میں مشغول رہے گا اور
اپنی پوری ذہنی صلاحیتوں کو صرف اسی کام میں لگا دیگا

تو پھر یقینی طور پر وہ اپنی ذاتی کمزوریوں اور اپنے ذاتی عیبوں کو فراموش کر دے گا اور نتیجہ میں اُس کی اپنی کمزوریاں شدت حاصل کر لیں گی اور اس کی انفرادی زندگی کو ناکارہ بنا دیں گی - اور اجتماعی زندگی کی تباہی اس طریقہ پر کہ عیب جوئی کی بری عادت سے لوگوں میں اختلافات پیدا ہوں گے، آپس میں ایک دوسرے کے خلاف اشتعال پیدا ہو گا پھر جو اشتعال کے نتیجے ہوا کرتے ہیں وہ لازمی طور پر سامنے آئیں گے اور اجتماعی امن و سکون کو ہمیشہ کے لیئے ختم کر دیں گے۔

اس بات کے پیش نظر کہ اسلامی معاشرے کا نظم خراب نہ ہو اور وہ انتشار اور فسادات سے محفوظ رہے عیب جوئی ہی کی طرح بعض دوسری خطرناک برائیوں سے بچے رہنے کی تعلیم قرآنِ حکیم کے سورۂ حجرات میں اس طرح دی گئی ہے (آیت ۱۱) ترجمہ یہ ہے: اے اہل ایمان! نہ تو مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہیئے کیا تعجب کہ وہ ان سے بہتر ہوں یعنی (جو اُن پر ہنس رہے ہیں اور اُن کا مذاق اُڑا رہے ہیں) اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہیئے کیا

عجیب کہ وہ عورتیں) اِن عورتوں سے بہتر ہوں اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب اور بُرے ناموں سے پکارو۔ ایمان کے بعد گناہ کا نام ہی بُرا ہے اور جو لوگ اب بھی توبہ نہ کریں گے وہ یقیناً ظالم ٹھہریں گے"۔ اس آیت میں جن برائیوں کو روکا گیا ہے وہ سب بھی عیب جوئی ہی کی طرح تباہکن مُضمرات رکھتی ہیں اس لیئے اسلام ان تمام برائیوں کی نشاندہی کر رہا ہے تاکہ انسان اپنے وہ انفرادی اور اجتماعی فرائض پورے امن و سکون کے ساتھ انجام دے سکے جن کے لیئے اُس کو پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۂ نور میں فرمایا گیا ہے (آیت ۱۹) جس کا ترجمہ یہ ہے: جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان بے حیائی کا چرچا رہے اُن کے لیئے دردناک سزا ہے اس دنیا میں بھی اور اِس کے بعد آخرت میں بھی"۔

غرض اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ معاشرے میں برائیوں کو پھیلنے سے پوری قوت کے ساتھ روکا جائے اور ایک لمحہ کے لیئے بھی اُن کی تشہیر نہ ہو۔ اِس کے بعد

جہاں تک انفرادی برائیوں کا تعلق ہے چونکہ اُن کا دائرہ شخصی حدود میں منحصر اور محدود ہوا کرتا ہے اس لیئے اُن کی اصلاح نسبتاً آسان ہوگی پھر ایک صالح معاشرہ خود بھی اپنے افراد کی اصلاحِ کردار میں بڑی مدد دیتا ہے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی عیب جوئی کی کوشش کرتا ہے اس کا ہر قدم جہنم میں ہوتا ہے اور اس کی ایک سزا تو یہ ہے کہ اللہ اس شخص کے اپنے عیب خود بخود دنیا پر ظاہر کر دیتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا ہے: کیا کہنا اُس مسلمان کا جس کو اپنے نفس کے عیبوں اور برائیوں کی تلاش اور اُن کی اصلاح دوسروں کی عیب جوئی سے روک دے اور اس کا موقع ہی نہ دے۔

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا ہے: جَھْلُ الْمَرْءِ بِعُیُوْبِہٖ مِنْ اَکْبَرِ ذُنُوْبِہٖ "مسلمان کے گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی برائیوں سے غافل ہو۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کی برائی اور عیب و گناہ سے واقف ہو جائے اور اُس عیب اور گناہ کو

مشہور کر دے بجائے اُس کے چھپانے اور اُس پر پردہ پوشی کرے، تو اللہ کے نزدیک اس شہرت دینے والے کو بھی وہی سزا پانے کا استحقاق ہوگا جس کا وہ گنہگار آدمی مستحق ہے بلکہ شہرت دینے کی وجہ سے اس شخص کی سزا میں اضافہ ہو جائے گا۔

حضورؐ انور نے ایک اور حدیث میں فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اے مسلمانو! تم آپس میں ایک دوسرے کے عیبوں کی ٹوہ نہ لگاؤ ورنہ ایسے شخص کو جو دوسروں کی عیب جوئی کرتا ہے اور انھیں رسوا کرنے کی کوشش کرتا ہے گھر بیٹھے ہی اللہ رسوائی دیدیتا ہے اور وہ خود بخود لوگوں میں بدنام ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ ہمارے لیئے ضروری ہے کہ ہم دوسروں کے عیب ڈھونڈنے کے بجائے اپنی ساری کوشش خود اپنی ہی برائیوں کو تلاش کرنے میں صرف کریں اور دوسروں کی اصلاح سے پہلے خود اپنی اصلاح کریں کیونکہ جو خود صحیح راستہ پر نہ ہو گا وہ دوسروں کی ہدایت کیسے کر سکتا ہے۔ اگر ہر شخص صرف اپنی ہی ذات کی اصلاح کا کام اپنے ذمہ لے لے تو سارا

معاشرہ خود بخود درست ہو جائے گا۔

سرورِ انبیاء کا فرمان ہے: انسان کا اِس سے بڑھ کر کوئی عیب نہیں کہ وہ دوسروں کے عیب تو دیکھے مگر خود اپنی برائیوں اور عیبوں کی طرف سے اُس کی آنکھیں بند ہوں۔

قانون کا احترام

"قانون" سے مراد وہ حد بندیاں ہیں جو بنی نوع انسان پر انفرادی اور اجتماعی طور پر معین ہوتی ہیں۔ بس اسی نقطۂ نظر سے جب کبھی کوئی شخص اسلام کے دائرہ میں آجاتا ہے تو وہ اس قانون کا پابند ہو جاتا ہے جسے اللہ نے اس کے لیے مقرر و معین فرمایا ہے۔ ان ہی قوانین اور پابندیوں کو "حدود اللہ" کے جملہ کے ساتھ بار بار قرآن پاک میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ کہیں ان لفظوں میں: وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (بقرہ ۲۲۹) "اور جو لوگ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں وہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں"۔ اور کسی جگہ یہ اس صورت سے فرمایا گیا ہے: وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِیْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ (نساء ۱۴) اور جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور وہ

اللہ کی مقررہ کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر گیا تو اللہ اسے جہنم میں داخل کرے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے بڑی رسوائی کا عذاب ہے۔"

ابھی عرض کیا گیا تھا کہ قانون کا تعلق انسان کی ذاتی اور اجتماعی زندگی دونوں ہی سے ہوا کرتا ہے اس لئے جہاں ایک مسلمان کی انفرادی اور نجی زندگی اسلامی قانون میں جکڑی ہوئی ہے ساتھ ہی اس کی زندگی کا اجتماعی رخ بھی قانون کا پابند ہے۔ غرض اس کی اپنی ذات اپنے گھر، اپنے کنبہ اور خاندان سے لیکر عام انسانی معاشرہ کی آخری حد تک اسلامی قانون کی دفعات اسے گھیرے ہوئے ہیں اور وہ ایک مخلص اور سچا مسلمان اسی وقت بن سکتا ہے جب وہ اس قانونِ خداوندی کا احترام کرے اور اس کی خلاف ورزی کی جسارت نہ کرے ۔

قانون کی پابندی کی اسی اہمیت کی طرف سورۂ النحل[۹۰] میں ان لفظوں میں کھلا ہوا اشارہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ " بے شک اللہ تمہیں

عدل کا حکم دیتا ہے اور نیکی کرنے کا اور رشتہ داروں کیساتھ حسن سلوک کا اور تم کو بدکاری اور ناشائستہ حرکتوں سے اور سرکشی کرنے سے منع کرتا ہے"۔

احترام قانون کے عام مفہوم میں وہ تمام معاہدے اور ذمہ داریاں نیز پیمان و قرار بھی شامل ہیں۔ جو کوئی مسلمان اپنے اوپر عائد کر لیتا ہے کیونکہ اسلام اُس کو عہد و قرار کی پابندی کا حکم دیتا ہے (سورۃ الاسرآء ۳۴/): وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ"۔ جب تم کوئی عہد کر لو تو پھر اُس کی پوری پابندی کرو"۔ اور یہ تو ظاہر بات ہے کہ ایک سچا مسلمان اسی عہد و قرار کو اپنے ذمہ لیگا جو شرعی اور عقلی حیثیت سے اس کے لیئے جائز ہو گا۔ غرض اسلام کے نزدیک عہد کی پابندی کرنا ضروری ہے۔ اب اس میں وہ تمام معاہدے بھی شامل ہو جاتے ہیں جو کسی ملک کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے کسی مسلمان پر عائد ہوتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ ملکی قوانین کی پابندی قطعی طور پر ایفائے عہد کے قرآنی فرمان میں داخل ہے۔ اس لیئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ جس ملک میں بھی رہتا ہو اس کے قانون کا احترام کرے

اور اسکے ساتھ ہی اسکا کوئی عمل اصولِ اسلام کے منافی نہ ہو۔ غور سے دیکھا جائے تو ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرنے میں بہت سے اُن جرائم کا بھی ارتکاب خود بخود ہو جاتا ہے جنہیں اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر اسمگلنگ یا چور بازاری اور ملاوٹ کرنے والے اُس وقت تک یہ کام نہیں کر سکتے جب تک کسی ملک کی انتظامیہ کے ساتھ پکے عہد و قرار کیے ہوتے ہوئے اس کی خلاف ورزی نہ کریں، جھوٹ نہ بولیں، دھوکا نہ دیں، تعاون علی الاثم، یعنی گناہ اور برائیوں میں کچھ لوگ باہم ایک دوسرے کی اعانت نہ کریں عقداروں کی حق تلفی کا ارتکاب نہ کریں، خیانت نہ کریں اور اسی طرح کے دوسرے شدید گناہوں اور برائیوں کے مرتکب نہ ہوں اور یہ سب باتیں اسلام کے نزدیک حرام اور ممنوع ہیں اور فساد ظلم کے عام مفہوم میں داخل ہیں جس پر قرآنِ پاک میں اللہ نے بار بار عذاب کا اعلان فرمایا ہے۔

غرض ایک سچے مسلمان پر فرض ہے کہ اللہ کے قانون کا بھی احترام کرے اور انسانی معاشرہ کے تمام جائز

قوانین کا احترام کرے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جو اللہ اور اللہ کے بندوں سے کیے ہوئے عہد و قرار کے خلاف ہو یا جس کی وجہ سے اسلام اور مُسلم معاشرہ کی توہین ہوتی ہو۔

مِلّی اِستحکام

کسی قوم کے قومی و ملّی استحکام یا تحفظ کے صرف دو رُخ ہوا کرتے ہیں ایک داخلی دوسرے بیرونی۔ اِن میں سے آخر الذکر یعنی بیرونی استحکام اگرچہ اپنے مقام پر بے حد اہمیّت کا حامل ہے لیکن یہ اُس وقت تک ممکن ہی نہیں ہو سکتا جب تک اُس قوم میں اندرونی طور پر بھرپور استحکام نہ پایا جاتا ہو اور قومی مفادات کے خلاف ہر سازش کا قلع قمع نہ کر دیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بات میں کسی شخص کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا کہ بیرونی حملے اور سازشیں اندرونی اور داخلی سازشوں ہی کی وجہ سے ہمیشہ کامیاب ہوا کرتی ہیں اور جب تک داخلی سازشیں اُن کا ساتھ نہ دیں اُنھیں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔ قوم و ملّت کی بقاء، استحکام اور عزت و سربلندی کا اصلی راز یہی ہے کہ اسکے داخلی حالات میں پورا نظم و ضبط موجود ہو۔ افرادِ ملّت میں

پوری یکجہتی اور اتحاد و اخوّت کا زبردست جذبہ پایا جاتا ہو
اور باہمی تعاون اور یگانگت کے ساتھ سب کے سب فردِ واحد کی
طرح ایک ٹھوس چٹان بن جائیں، ایک کا دکھ درد دوسروں کا
دکھ درد ہو اور ایک کی خوشی دوسروں کی خوشی اور مسرّت ہو۔ یہی
اتحاد اور آپس کی یکجہتی وہ چٹان ہوتی ہے جس سے بیرونی
طاقتوں کو اس قوم پر تسلّط جمانے کی کبھی ہمت نہیں ہوتی اور
جو بھی اس چٹان سے ٹکراتا ہے وہ خود ہی پاش پاش ہو کر
رہ جاتا ہے اس بنا پر جو قومیں اپنے اندرونی خلفشار کو
نہیں روکتیں اور اُن کی طرف سے غفلت برتا کرتی ہیں اور اپنی
داخلی صفوں کو درست نہیں رکھتیں وہ ہمیشہ دوسروں کی محتاج
بھی رہتی ہیں اور بیرونی سازشوں اور حملوں کا دفاع کرنے
کی صلاحیت بھی کھو بیٹھتی ہیں۔ اسی باہمی اتحاد کی عظیم
طاقت کی طرف سورۂ آل عمران (۱۰۳) میں ان لفظوں سے اشارہ
کیا گیا ہے: "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا" تم سب کے
سب رشتۂ الٰہی کو مضبوط پکڑ لو اور آپس میں ٹکڑے ٹکڑے
نہ ہو جاؤ۔ اور اس بات کی طرف سورۂ انفال (۴۶) میں اس طرح
متوجہ فرمایا گیا ہے: "وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ"

آپس میں جھگڑا اور اختلاف نہ کرو ورنہ تم ہمّت ہار جاؤ گے اور تمہاری ساکھ اکھڑ جائے گی۔ اسی حقیقت کی جانب سورۂ الصّف (۴) میں "بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ" سے اشارہ ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ ہمیشہ داخلی استحکام کو ہر بات پر مقدّم رکھا جائے۔ اندرونی اور داخلی سالمیت اور استحکام سے مراد صرف فوجی اور دفاعی سطح کی صلاحیت اور استحکام یا اس کے نظم وضبط کا اعلیٰ معیار قائم رکھنا ہی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہر سطح پر استحکام ہے یعنی ملّت کی صفوں میں جن جن باتوں سے ابتری، بدنظمی اور خلفشار ممکن ہو سکتا ہے ان سبکو دور کر دیا جائے۔ خواہ وہ تجارتی مسائل ہوں، اقتصادی امور ہوں، سیاسی الجھنیں ہوں، تعلیمی دشواریاں ہوں، زراعت محنت، اُجرت، ملازمت، مقدّمات کے فیصلے۔ محنت کش طبقہ کے حقوق غرض جو کچھ بھی کسی قوم کے داخلی مسائل ہو سکتے ہوں اُن میں بھرپور عدل وانصاف سے کام لیا جائے یعنی داخلی نظام اسقدر مکمّل ہو جس میں کسی شخص کی بھی حق تلفی کی گنجائش نہ پائی جائے اور ملّت کی عدلیہ اور انتظامیہ کی نگاہ میں ذاتی اور طبقاتی مفادات کا شائبہ بھی نہ پایا جاتا ہو اور ساتھ ہی انتظامیہ اور

اس ملت کے عوام میں پورا پورا تعاون ہو اور ان میں سے ایک طبقہ کو دوسرے پر مکمل اعتماد اور بھروسا ہو۔ اس قسم کا داخلی استحکام وہ بنیادی پتھر ہے جس پر بیرونی استحکام اور سالمیت کی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔

بالکل صاف سی بات ہے کہ درخت کتنا ہی بڑا ہو اور اس کی شاخیں کتنی ہی مضبوط ہوں لیکن اگر اس کی جڑوں کو دیمک نے کھالیا اور اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے تو وہ آندھی اور طوفان کیسا، ہوا کے ایک معمولی سے تھپیڑے ہی سے زمین پر آرہے گا۔ اس بنا پر ملی استحکام و سالمیت جس قدر بیرونی دنیا کے مقابلہ میں ضروری ہے اس سے کہیں زیادہ اندرونی مسائل کے لئے ضروری ہے۔

بیرونی دشمنوں کو ہمیشہ کسی قوم پر ذہنی یا مادی حملہ کی جرأت محض اسی وقت ہوا کرتی ہے جب اس قوم کے متعلق اسے اس بات کا یقین ہو جائے کہ اس میں اپنے اچھے برے کو سمجھنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے اور یہ اپنے دشمن اور دوست میں تمیز نہیں کر سکتی۔ اس میں کا ہر آدمی ذاتی یا جماعتی مفاد پرستی میں مبتلا ہے اور اس قوم کا کوئی ٹھوس اور واحد نظریۂ زندگی

باقی نہیں رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بیرونی استحکام سے پہلے یا ساتھ ہی ساتھ قوم کی اندرونی خرابیوں کو بھی دور کیا جائے، اس کی صفوں سے ابتری اور انتشار کو ختم کر دیا جائے، انفرادی مفادات کے زہر کو قومی زندگی کی جڑوں سے صاف کر دیا جائے، عوام کو اقتصادی طور پر پوری طرح مطمئن اور خوشحال بنا دیا جائے تاکہ وہ بیرونی طاقتوں کے فکری اور اخلاقی حملوں کے زہر کو بھی محسوس کر سکیں اور اُن کے دفاع کی صلاحیت حاصل کریں۔ "ملّی استحکام" کا مفہوم بہت گہرا اور بہت زیادہ وسیع ہے، اور یہ اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک کسی ملک کا معاشرہ درست نہ ہو۔

اسلام نے ہمیں اپنے داخلی تحفّظ اور استحکام کی بھی تعلیم دی ہے اور اس کے ساتھ ہی بیرونی استحکام کی بھی لیکن داخلی استحکام پر نسبتہً زیادہ زور دیا ہے۔ اسی بنا پر سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے مدینہ کی طرف ہجرت کے موقع پر سب باتوں سے پہلے اسی پر توجہ فرمائی تھی اور مدینہ میں تشریف لاتے ہی آپس میں ایک کو دوسرے کا بھائی بنا دیا تھا اور یہی اخوت بعد میں ہر موقع پر کام آتی رہی۔ آج بھی ہماری بقا اور

ہمارا استحکام اور ہماری ملکی و ملّی سالمیّت صرف اسی میں ہے کہ ہم اپنے معاشرہ میں بھرپور نظم و ضبط اور ہم آہنگی پیدا کریں اور ساتھ ہی اپنی دفاعی صلاحیت کو اجاگر کریں اور قرآن کریم کی اس ہدایت کو اپنے سامنے رکھیں "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ" یعنی تم اپنے دفاع کے لیئے جس قدر بھی تمہارے امکان میں ہو قوت و طاقت اکٹھا کرو۔ (سورۂ انفال/۶۰)

ابھی گذشتہ قریبی زمانہ میں ہمارا ملک جس تباہ کن امتحان سے گذرا تھا وہ سب ہی کو معلوم ہے جبکہ عام ذہنوں میں یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ یہ کشتی اب ڈوبے بغیر نہیں رہے گی۔ لیکن اللہ نے مدد کی اور اس کشتی کو ابھارنے والے سامنے آگئے اور اب وہ وقت بھی آگیا جب ساری مایوسیاں امیدوں کی روشن شعاعوں میں بدل چکی ہیں۔ اور ملتِ پاکستان اب عزت و پابندی کی اس منزل پر ہے جہاں پہلے کبھی نہ تھی۔

اللہ خود کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا بلکہ وہ قوم خود ہی اپنے اعمال سے اپنی حالت کو بدلتی ہے اور اُن ہی اعمال کے نتیجہ میں تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ ہم نے اپنے قریبی ماضی میں یہ سب باتیں دیکھ لی ہیں اس لیئے

اب ہمیں اس جدید امتحان میں اس کا اپنے عمل سے ثبوت دینا چاہیئے کہ ہم ایک با احساس قوم ہیں اور جس طرح ہم مصیبتوں کے طوفانوں میں اپنے فرائض کو نہیں بھولتے اسی طرح کامیابی اور فتحمندی اور آرام و راحت میں بھی اپنے فرض سے غفلت نہیں کرتے ۔ کامیابی صرف اسی قوم کے قدم چومتی ہے جو مصیبتوں سے بے بس ہو کر یا آرام و خوشحالی سے مدہوش ہو کر کسی حالت میں بھی اپنے صحیح راستہ سے نہیں ہٹتی ۔

ایثار و ہمدردی

دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدّم رکھنے کا نام ''ایثار'' ہے۔ ایثار کی صفت صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب آدمی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ موجود ہو اس لیئے ایثار اور ہمدردی کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ ایثار کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کے دل میں دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا ایسا جذبہ پیدا ہو جائے کہ وہ اُن کی بھوک کے مقابلہ میں اپنی بھوک کو بھول جائے، اُن کی پیاس کو اپنی پیاس پر مقدّم کر دے اور ان لوگوں کی ہر ضرورت اور حاجت یا تکلیف اور راحت کے سامنے اپنی ضروریات اور اپنی تکلیف اور راحت و آرام کو ترجیح نہ دے۔

اس عظیم اخلاقی بلندی کو حاصل کرنے کے لیئے قرآنِ حکیم نے مسلمانوں کو جس قدر تاکید کے ساتھ ہدایت کی ہے وہ سورۂ حشر میں خدا کے اس ارشاد سے ظاہر ہے:(آیۃ/۹)

وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ ھَاجَرَ اِلَیْھِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِھِمْ حَاجَۃً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ ط وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ط"

یہ آیت مہاجرین و انصار کی باہمی محبت اور دوستی کے واقعات سے متعلق ہے ۔ مکہ سے جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ میں آئے تو وہاں کے مسلمانوں یعنی انصار نے اُن کے ساتھ جس ہمدردی اور محبت کا سلوک کیا وہ اسلامی تعلیم اور اسلامی زندگی کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا ۔ انصار نے مہاجروں کو نہ صرف زمینیں دیں، باغ دیئے، مالی اور ہر طرح کی امداد کرتے رہے، بلکہ خود تکلیفیں اٹھائیں اور مہاجروں کو آرام دیا خود مصیبتیں جھیلیں اور انھیں راحت پہنچائی ۔ یہاں تک کہ جب بنو نضیر کی زمین پر قبضہ ملا تو انصار کے دو آدمیوں کے سوا سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وہ ساری زمین تمام مہاجروں میں تقسیم فرما دی ۔ انصار نے آنحضرتؐ کے اس فیصلہ کو نہ صرف انتہائی فرماں برداری کے ساتھ قبول کیا بلکہ دل سے اس پر خوشی کا اظہار کیا۔

خدا نے اس آیت میں انصار کی اِس صفت اِیثار کی تعریف فرمائی ہے "اور جو لوگ مہاجروں سے پہلے (ہجرت کے) گھر (مدینہ) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے، ہجرت کرکے اُن کے پاس آنے والوں سے محبّت رکھتے ہیں اور جو کچھ اُن کو (یعنی مہاجروں کو) ملا اس کی اپنے دلوں میں کچھ غرض نہیں رکھتے اور اگرچہ اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو دوسروں کو اپنی ذات پر مقدّم رکھتے ہیں اور جو شخص اپنے نفس کی حرص (یعنی لالچ) سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔"

اگر غور سے دیکھا جائے تو ساری اخلاقی خرابیوں کی جڑ یہی حرص اور لالچ ہے۔ اسی لالچ کی وجہ سے آدمی دوسروں پر ظلم کرتا ہے، اُن کے مال میں خیانت کرتا ہے، چوری کرتا ہے اور دوسرے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہی حرصِ نفس اسے دوسرے انسانوں کے حقوق سے لاپروائی کا سبق دیتی ہے اور یہی آپس میں دشمنی اور عداوت کا بنیادی سبب ہوتی ہے۔ اس لئے خدا فرماتا ہے کہ جو لوگ اپنے نفس کی اس بُری صفت یعنی حرص اور لالچ کے شر سے بچ گئے وہی لوگ کامیابی حاصل کریں گے۔ غرض دوسروں کی ضرورت کو اپنی حاجت پر مقدّم

رکھنا بڑی قابل تعریف صفت ہے اور ایسے لوگوں کا درجہ خدا کے نزدیک بہت بڑا ہے جن میں یہ صفت پائی جائے۔ یہی ایثار کی صفت ہی تھی جس نے مسلمانوں کے ابتدائی دور میں ایسا مثالی اتحاد و اتفاق اور باہمی الفت و محبت پیدا کر دی کہ ہر وقت ایک دوسرے کے پسینہ پر اپنا خون بہانے کے لیئے تیار رہتا تھا اور اسی ایثار محبت اور ہمدردی کا نتیجہ تھا کہ انتہائی افلاس و تنگدستی کے ہوتے ہوئے اور مادی وسیلے نہ ہونے کے باوجود کبھی اسلام کے دشمن اسلامی مرکز کو نقصان نہ پہنچا سکے اور دشمنوں کی منظم اور قوی ترین سازشیں خود ہی فنا ہو کر رہ گئیں۔ مسلمانوں میں ہر شخص اپنی ذات کو جماعتی مفاد کے سامنے بھولا ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے پہلے دوسروں کی تکالیف دور کرنے کا خیال رہتا تھا۔ اہم ترین رخ اس بحث کا یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور ایثار کے جذبہ سے پورے معاشرہ کو قوّت حاصل ہوتی ہے اور مجموعی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ ایثار و ہمدردی کے نتیجہ میں سارا معاشرہ ترقی کرتا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ جب معاشرہ بہتر مقام حاصل کرے گا تو اس مجموعی فلاح و بہبود

کا اثر اس کے تمام افراد تک پہنچے گا اور وہ سب ہی اُس سے فائدہ اٹھائیں گے اس کے برخلاف اگر ہر شخص اپنے ہی فائدہ کو مقدّم رکھے تو نتیجہ میں سارا معاشرہ تباہ ہو جائے گا اور وہ افراد بھی خود بخود تباہ و برباد ہو جائیں گے جو اپنی انفرادیت کے تخیّل میں اس کو بالکل بھول گئے تھے کہ دوسروں کو فائدہ پہنچانا اور دوسروں سے ہمدردی کرنا درحقیقت اپنی ذات ہی سے ہمدردی کرنا اور اسی کو فائدہ پہنچانا ہے خلاصہ یہ کہ فرد کی ذاتی تعمیر، ترقی اور بقاء و استحکام صرف اسی وقت ممکن ہے جب خود معاشرہ میں استحکام ہو اور یہ بات صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ افراد کے اجتماعی رابطے مضبوط ہوں، ہر فرد کے دل میں دوسرے کی عزت، محبت اور ہمدردی ہو، ایک دوسرے کے دُکھ اور ضرورت کا احساس کرے اور اس میں پوری طرح تعاون کرے اسلام کے ابتدائی دور میں انصار کا پُرخلوص برتاؤ مہاجرین کے ساتھ اور مہاجرین کی محبت و اُلفت انصار کے ساتھ جس مثالی صورت میں ہمارے سامنے ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہم آج بھی اس مثال کو اپنے لیئے شمعِ راہ بنائیں اور ایثار و محبّت، ہمدردی و اخوّت کی ایسی مثالیں پیش کریں جیسی

ہمارے پیش رو پیش کر چکے ہیں۔

ہمارے سامنے واقعات بھی ہیں اور نظریات و احکام بھی۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اسلام کی اس عظیم تعلیم کو صرف نظریہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ عملی حیثیت سے بھی تسلیم کریں یعنی اس پر عمل کریں اور اپنے دلوں میں دوسرے انسانوں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ پیدا کریں۔

ایک مرتبہ ایک بھوکا آدمی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت حضورؐ کے یہاں پانی کے سوا کچھ نہ تھا اس لیے حکم ہوا کہ جو شخص آج رات اس بھوکے کو اپنا مہمان بنائے گا اللہ اس پر رحم فرمائے گا۔ انصار کے ایک شخص نے حکم نبویؐ کی بنا پر اس شرف کو حاصل کیا۔ اور اُسے اپنے مکان پر لے گیا زوجہ سے دریافت کیا کہ کچھ کھانے کا سامان ہے؟ انھوں نے کہا۔ صرف بچوّں کا کھانا موجود ہے۔ انصاری نے کہا کہ بچوّں کو یوں ہی بھوکا سُلا دو اور چراغ کو بجھا دو ہم سب رات بھر بھوکے رہیں گے مگر اپنے مہمان پر اپنی بھوک کو ظاہر نہیں کریں گے۔ آخر صبح کو جب انصاری نبیؐ کریم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ خدا تمہارے حُسنِ سلوک

اور ایثار و محبت سے بہت خوش ہوا۔

غرض ایثار کی صفت انسانیت کا بلند ترین جوہر ہے اور سچے ایمان کی نشانی ہے۔ اگر اس اعلیٰ صفت کو حاصل کرنے کی ہر شخص کوشش کرے تو دنیا کے یہ سارے فسادات، یہ نسلی اور لسانی امتیازات اور یہ خطوں اور قوموں کی تفریق مٹ جائے۔ اختلافات اور جھگڑے فنا ہو جائیں اور یہ کرۂ زمین امن کی جنت میں تبدیل ہو جائے۔

اصل یہ ہے کہ زیادہ تر جھگڑے اور فساد محض اس وجہ سے ہوا کرتے ہیں کہ ہر شخص صرف اپنی ذات ہی کا فائدہ چاہتا ہے چاہے دوسرے کو کتنا ہی نقصان پہنچ جائے۔

چند ٹکوں اور ذرا سے ذاتی فائدے کے لیئے دوسرے کی عزت و آبرو یہاں تک کہ اس کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا جس کے نتیجہ میں اشرف المخلوقات انسان کی یہ موجودہ زندگی بڑی بھیانک نظر آنے لگی ہے۔ اسلام نے ہمیں جو راستہ بتایا ہے اسی میں زندگی کی ان الجھنوں کا صحیح حل موجود ہے اور اسی میں ہماری نجات کا راز پوشیدہ ہے۔ سچا مؤمن وہی ہے جو اسلام کی ہدایت پر عمل کرے اور دوسروں کی ضرورت اور دکھ درد کا اپنی

ضرورت اور اپنے درد سے زیادہ احساس کرے اور خود اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک اُس کے دوسرے انسانی بھائیوں کو چین نصیب نہ ہو۔

قرآنِ حکیم نے ہمیں ایثار و محبت کی تعلیم دی ہے۔ سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے اپنے ارشادات اور سیرتِ پاک سے ہمیں اس کی عظمت سمجھائی ہے۔ صحابۂ کرام کا برتاؤ ہمارے سامنے ہے، اہلِ بیتِ اطہار کی مقدس زندگی ہمیں معلوم ہے اس لیئے ہر مخلص اور پکّے مسلمان اور سچّے توحید پرست کے لیئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی ایثار اور ہمدردی کی صفت کو اپنے کردار کی تعمیر کی بنیاد بنا کر ایسی عملی مثال پیش کرے جو ایک حقیقی اور سچّی اسلامی زندگی کی علامت ہے۔

اِسمگلنگ

اسلام نے تجارتی کاروبار اور لین دین کے تمام اُن طریقوں کو جائز بلکہ بعض اوقات انتہائی ضروری قرار دیا ہے جو ایسے اصول اور ضابطوں پر مبنی ہوں جن سے لوگوں کے انفرادی اور اجتماعی حقوق پر ضرب نہ پڑتی ہو یا ان کے سبب سے جائز ذمّہ داریوں اور جائز اختیارات میں اللہ کے مقرر کئے ہوئے حدود سے تجاوز نہ پیدا ہوتا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی شخص کے حقوق پر ناجائز قبضہ نہ ہو، عہد کی خلاف ورزی، فریب، چوری، بددیانتی، جھوٹ، ملاوٹ، بے ایمانی، رشوت، ظلم، جان و مال اور آبرو کی بربادی۔ غرض ان میں سے اور اسی طرح کی دوسری باتوں سے کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے انسانی کردار پر دھبّا لگتا ہو اور اللہ کے احکام کی تعمیل میں فرق آسکتا ہو۔ سورۂ نسآء[۲۹] میں اللہ نے ان باتوں کی طرف ایک ہی جملہ سے اشارہ فرما دیا ہے:

"یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ" اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو حرام طریقوں سے نہ کھاؤ۔ اس ایک لفظ "باطل" کہہ کر قرآنِ حکیم نے اُن تمام راستوں کو بند کر دیا ہے جن سے لین دین میں کوئی بھی غلط طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہو اور جن میں بے ایمانی اور بد دیانتی اور آپس کے معاہدوں کے خلاف عمل کرنے کو ذرا سی بھی مدد مل سکتی ہو۔ "اسمگلنگ" کا بھی مطلب یہی ہوتا ہے کہ چیزوں کی درآمد و برآمد غیر قانونی طریقوں سے کی جائے اور اس طرح ملکی قانون سے بچاؤ غیر قانونی طور پر کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس بدترین اخلاقی اور غیر اسلامی جرم کے اندر خود بخود اور بھی بہت سے جرم جمع ہو جاتے ہیں جن سے اس کی شدّت بے حد بڑھ جاتی ہے جبکہ اگر یہ صرف ایک ہی بُرائی ہوتی جب بھی وہ برائی اِس عمل کے غیر اسلامی ہونے کیلئے کافی تھی۔ اب آپ ذرا غور سے اور پوری حقیقت شناسی سے دیکھیں تو یقیناً اس بات کو آسانی کے ساتھ محسوس کر لیں گے کہ اس عمل سے قدم قدم پر جھوٹ بولنے کی عادت پڑتی ہے کیونکہ اسمگلنگ بغیر جھوٹ بولے ممکن نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ تو

واضح بات ہے کہ جو عمل کسی ایسے عمل پر منحصر ہو جو حرام ہو جیسے جھوٹ بولنا تو وہ عمل بھی یقیناً حرام ہو گا۔

اسلامی زندگی کی بنیاد سچائی پر قائم ہے جس کا اسمگلنگ سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ قرآن میں جا بجا اللہ نے جھوٹوں پر لعنت کی ہے اس لیئے جو کام جھوٹ بولنے پر موقوف ہو وہ بھی یقیناً قابل لعنت ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی اسمگلنگ کرنے والا اُس عہد و قرار کی خلاف ورزی کرتا ہے جو اُس نے ملک کی حکومت اور اُس کی انتظامیہ سے کیا ہے۔ اسلام کا حکم یہ ہے کہ عہد کی پابندی کرو۔ اس بنا پر اسمگلنگ کا عمل مسلسل عہد کی خلاف ورزیوں اور اس سے غداری پر مشتمل ہوا کرتا ہے اس وجہ سے بھی اسمگلنگ کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی ایک بڑی بنیاد حرص اور لالچ نیز ناجائز نفع خوری ہے اس لیئے بھی یہ حرام ہے۔ اسمگلنگ کے کام میں قدم قدم پر رشوت ستانی ہوتی ہے جو ہر شکل اور ہر نام اور ہر صورت میں حرام ہے اس لیئے اسمگلنگ بھی غیر اسلامی اور قطعی طور پر حرام ہے۔ اس کے علاوہ اسمگلنگ سے بے حیائی پیدا ہوتی ہے، جرائم گناہ کی تخلیق ہوتی ہے، اپنی

اور دوسروں کی عزت و آبرو اور جان و مال کے ضائع ہونے کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے اور جس عمل میں یہ باتیں ہوں وہ اسلام کے نزدیک قطعاً حرام ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر اسمگلنگ کے حرام ہونے میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں رہ سکتا۔ پھر جبکہ ہم کو یہ معلوم ہو گیا کہ اسمگلنگ کیا ہوا مال حرام طریقوں ہی سے حاصل ہوتا ہے تو اس کا لازمی شرعی نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ ایسے مال کا خریدنا اور استعمال کرنا بھی حرام ہو گا اور اس قسم کی چیزوں کے ساتھ نماز اور دوسری عبادتیں بھی باطل ہوں گی۔

ایک سچے مسلمان کا فرض ہے کہ اپنی پوری زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھالے اور ایسے کام کے قریب بھی نہ جائے جو اللہ کے حکم اور اس کی مرضی کے خلاف ہو۔ بلا شبہ اسمگلنگ کا عمل بد بھی اسی قسم کے فواحش میں داخل ہے جنہیں اللہ نے سورۂ اعراف ۳۳ میں اپنے اس فرمان سے حرام قرار دیا ہے: قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (اے میرے رسول تم لوگوں کو بتا دو کہ میرے پروردگار نے "فواحش" یعنی برائی کے تمام کاموں کو جو ظاہر بظاہر ہوں یا چھپے چوری کیئے جائیں سب کو حرام کر دیا ہے۔

شہادتِ کبریٰ

جلد اوّل

● واقعۂ کربلا انسانی تاریخ کا عظیم ترین واقعہ ہے تقریباً چودہ سو سال سے دُنیا کے تمام مفکر اس کے اسباب و نتائج پر غور کرتے رہے چنانچہ

علامہ سید محمد رضی مجتہد العصر جانشین سرکار نجم العلماء اعلی اللہ مقامہٗ

نے بھی کئی برس کی سخت کاوش اور عرق ریزی کے بعد "شہادت کبریٰ" کے نام سے واقعات کربلا پر مشتمل ۳ جلدیں ترتیب دی ہیں۔ اس سے پہلے کوئی کتاب ایسی نہ تھی جس میں امامِ عالی مقام کی شخصیت اور ان کے عدیم المثال کارناموں کو تفصیل سے جمع کیا گیا ہو اور پھر اس پر تبصرہ اور تفصیلی بحث کی گئی ہو۔

شہادتِ کبریٰ اپنے مضامین، ٹھوس تحقیق اور دلائل کے سلسلے میں مستند کتابوں کے حوالہ جات کے پیش نظر "سانحہ کربلا" پر نئے انداز کی منفرد کتاب ہے۔ جلد اوّل ۶۷۲ صفحات پر مشتمل ہے سائز ۲۶×۲۰ کا $\frac{1}{8}$ جلد مضبوط۔ کاغذ عمدہ کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے کے نتیجہ میں اب بہت کم تعداد میں رہ گیا ہے کتب فروش جلد توجہ دیں کمیشن معقول دیا جاتا ہے۔

خط و کتابت کا پتہ:۔ ادارۂ نشرِ علوم دینیہ
سی ۹۶۔ بلاک نمبر ۱۰ فیڈرل بی ایریا کراچی
فون نمبر ۶۸۳۰۲۵

شہادتِ کبریٰ

جلد دوم — جلد سوم

زیر کتابت ہے صفحات ۵۰۰

مسودہ زیر ترتیب ہے

- کربلا کی جنگ کی تفصیل !
- شہدائے کربلا کے تفصیلی حالات !
- کوفہ و شام کے تمام تر واقعات !
- مدینہ میں قافلۂ حسینی کی واپسی کی تفصیلات !

انتہائی دل پسند انداز اور سلیس زبان میں درج ہیں۔ "شہادت کبریٰ" معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ مطالعہ کیجئے!

- کتب فروشوں کو معقول کمیشن دیا جاتا ہے۔
- لائبریری کے لئے خصوصی رعایت ملتی ہے۔

خط و کتابت کا پتہ

ادارۂ نشر علوم دینیہ

سی ۹۶ بلاک نمبر ۱ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

فون نمبر ۶۸۳۰۲۵

درسِ قرآنِ حکیم

علّامہ سیّد محمّد رضی مجتہد

جو اپنی ٹھوس علمی صلاحیتوں کی وجہ سے ایک اہم مقام رکھتے ہیں
اُنھوں نے ریڈیو پاکستان سے انتہائی سلیس اور عام فہم زبان میں
قرآن حکیم کے جو درس نشر کئے وہ دو حصوں پر مشتمل ہیں۔
پہلا حصّہ بارِ دوم۔ اور دوسرا حصّہ بارِ اوّل زیورِ طباعت سے
آراستہ ہو چکا ہے۔

- درسِ قرآن میں ایک ایسا ضابطۂ حیات مضمر ہے جس کے مطالعہ سے آپ کا دل و دماغ نورِ الٰہی سے منور ہو جائے گا۔
- آپ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں صراطِ مستقیم پر چلکر دنیاوی کامیابی اور اُخروی دولت سے مالا مال ہوں گے۔

آپ کے لئے درسِ قرآنِ حکیم کا مطالعہ ضروری ہے۔

خط و کتابت کا پتہ

ادارۂ نشرِ علومِ دینیہ
سی ۹۶ ۔ بلاک نمبر ۱۔ فیڈرل بی ایریا کراچی
ٹیلیفون نمبر:۔ 683025

"خُطبات"

حصّہ اوّل تا حصّہ پنجم

خطبات کا ہر حصّہ ۳۵۰ – اور ۴۰۰ صفحات کے درمیان صفحات پر مشتمل ہے۔ سائز ۳۰ × ۲۰ کا ⅛ کاغذ عمدہ۔ سفید۔ طباعت دیدہ زیب۔ کتابت صاف اور دلکش!

کتب فروشوں کو معقول کمیشن دیا جاتا ہے

"خُطبات"

علامہ سید محمد رضی مجتہد

کی اُن سینکڑوں بصیرت افروز تقریروں کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے ریڈیو پاکستان اور ٹیلیویژن سے نشر کی ہیں اور جن سے اس کرۂ ارض کے کروڑوں تشنگان علم سیراب ہوئے ہیں۔ ان تقاریر کی افادیت اور مقبولیت کا سکہ پوری دنیا پر جم چکا ہے۔

خُطبات کا ہر حصّہ مضمون کی اہمیت کے لحاظ سے بے حد مفید ہے، طلبہ و طالبات کو مضمون نگاری میں مدد ملے گی۔ اُن کی علمی معلومات میں اضافہ ہوگا ذاکرین اور مقررین کے لئے بھی بہترین معاون ثابت ہوگا۔

پتہ: - ادارہ نشر علوم دینیہ - سی ۹۶ - بلاک نمبر ۱ فیڈرل بی ایریا کراچی
فون: 683025

علامہ سید محمد رضی مجتہد کی تصنیفات کی مکمل فہرست

• ادارۂ نشر علوم دینیہ
سی ۹۶ - بلاک نمبر ۱ فیڈرل بی ایریا کراچی
سے طلب کیجیے

• علامہ سید محمد رضی مجتہد کو سرکار نجم العلماء اعلی اللہ مقامہ نے اپنی ایک خصوصی وصیت کے ذریعہ بحیثیت مجتہد اپنا شرعی وصی و جانشین مقرر کیا تھا

• سرکار آیتہ العظمی حجتہ الاسلام مولانا سید سبط حسین صاحب قبلہ مجتہد نے آپ کو خصوصی اجازۂ اجتہاد عطا فرمایا ۔ اور لسان العلماء کا خطاب دیا۔

• علامہ سید محمد رضی مجتہد مدظلہ تفسیر، فقہ، کلام، فلسفہ، منطق، ہیئت اور دیگر اسلامی علوم کی مثالی مہارت کے ساتھ ہی ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ علامہ کی نثر نگاری اور زور تحریر ان کی تقریروں اور خطابت کی طرح اپنی مثال آپ ہی ہیں جس کا اندازہ ان کے مقالات اور مضامین سے ہر صاحب بصیرت آسانی سے لگا سکتا ہے

• علامہ نے انگریزی زبان کی تحصیل میں بھی وقت صرف کیا ۔ اور برٹش کالج لندن سے فرسٹ کلاس ڈپلومہ حاصل کیا ۔ علامہ نے ہمیشہ ٹھوس علمی خدمات کے لئے خود کو وقف رکھا ہے۔ اب تک شہادت کبریٰ جلد دوم اور سوم کے علاوہ تقریباً نوّے کتابیں، کتابچے اور رسالے منظر عام پر آچکے ہیں ۔ کتب فروش جلد توجہ دیں کمیشن معقول ہے کتب فروش مخصوص کاروباری سہولت سے فائدہ اٹھائیں

(ادارہ)

فون: 683025